نگار

قواعد رسالہ "نگار"

۱ رسالہ ہر مہینے کی پندرہ تاریخ سے پہلے شایع ہوتا ہے

۲ رسالہ نہ پہونچنے کی صورت میں بیس تاریخ تک دفتر کو اطلاع ہونی چاہیے ورنہ رسالہ مفت نہ روانہ کیا جائیگا

۳ خط کتابت کے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیے - جنپر نمبر خریداری نہیں ہوتا ایسے خطوط ضایع کردے جاتے ہیں

۴ جواب طلب امور کے لئے جوابی کارڈ یا ٹکٹ آنا ضروری ہے

۵ مضامین صاف اور خوشخط آنے چاہیئے

٦ سالانہ قیمت پانچ روپیہ - ششماہی تین روپیہ - بیرون ہند سات روپیہ سالانہ پیشگی مقرر ہے

نرخنامہ اجرت اشتہارات

تعداد صفحہ	یک صفحہ	نصف صفحہ	پاؤ صفحہ
بارہ مرتبہ	۱۰۰ روپیہ	٦۰ روپیہ	۴۰ روپیہ
چھ مرتبہ	٦۰ روپیہ	۳۵ روپیہ	۲۳ روپیہ
تین مرتبہ	۳۵ روپیہ	۲۰ روپیہ	۱۲ روپیہ
ایک مرتبہ	۱۲ روپیہ	۸ روپیہ	۵ روپیہ

(۱) اجرت ہر حال میں پیشگی آنا ضروری ہے (۲) جو صاحبان تین ماہ سے زائد اشتہار دیں گے اُن کو بیس فیصدی کمیشن دیا جائیگا (۳) میعاد اشتہار کے اندر دو مہینے قبل اطلاع دینے پر مضمون بدل سکتا ہے

نگار بُک ایجنسی لکھنؤ

نگارستان
(دوسرا اڈیشن)
حضرت نیاز کے اور متعدد مضامین اور افسانے شامل کیے گئے ہیں نگارستان نے ملک میں جو درجہ قبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کیے گئے۔
قیمت عـ۲ـہ

گہوارۂ تمدن
(دوسرا اڈیشن) مولانا نیاز کی وہ معرکتہ الآرا کتاب جسمیں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصہ لیا ہے اور دنیا ے تہذیب و شائستگی اسکی کس قدر ممنون ہے۔ اردو میں بالکل پہلی کتاب ہے۔ قیمت علاوہ محصول عـ

شہاب کی سرگزشت
حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے۔ اس زبان کی اسکی تخییل اسکی نزاکت بیان اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچی ہے قیمت علاوہ محصول عـہ

فراست الید
مولفہ نیاز فتحپوری جس کے مطالعہ سے ایک شخص آسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت عروج و زوال موت و حیات صحت، بیماری، شہرت و نیکنامی وغیرہ کے متعلق صحیح پیشین گوئی کرسکتا ہو قیمت علاوہ محصول عـہ

شاعر کا انجام
جناب نیاز کے عنفوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ حسن و عشق کی تمام لذت بخش کیفیات اسکے ایک جملہ میں موجود ہیں علاوہ محصول ۱۰

جذبات بھاشا
جناب نیاز نے ایک مبسوط تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کیے ہیں انکی ایسی تشریح کی ہے کہ دل آویز ہو جاتا ہے قیمت علاوہ محصول ۱۲

صحابیات
جسمیں عہد رسالت کی ۵۰ خواتین کے مستند حالات لکھ دیے گئے ہیں اسکا مقدمہ خاص نیاز نے لکھا ہے۔ قیمت علاوہ محصول عـ

تذکرہ خندۂ گل
مولفہ عبدالباری آسی جسمیں ۳۰۰ سے زائد شعرا فارسی کے حالات مع انکے لطائف و ظرائف کے اور انکے کلام کے درج ہیں قیمت محصول ۲

بسم اللہ

نگار

جلد ۲۰ فہرست مضامین ماہ ستمبر ۱۹۳۱ء شمارہ ۳

مضمون	مصنف	صفحہ
ملاحظات	اڈیٹر	۲
مطالعۂ حدیث	"حق گو"	۹
ٹیلی فون ۶۷۰	اڈیٹر	۲۱
اقبالنامۂ جہانگیری	عبدالمالک آروی	۲۹
قصر شیریں	"ابن السبیل"	۴۱
لسانیات کے اصول اولین	"محقق اعظمی"	۵۳
اردو شاعری اور بیکاری	نورالحسن ہاشمی	۶۹
باب الاستفسار:		۷۸
اسلام کے اسلحۂ آتشبار	اڈیٹر	
تسبیح دشمن پر تاریخی روشنی	"	
فلکیات کی عجائب وغرائب	"	۸۲
سرور کونین (نظم)	علی اختر	۸۸
دہقانی لڑکی (نظم)	طالب باغپتی	۹۲
سیل جذبات (نظم)	عدم	۹۵
حسن کا عروج (نظم)	افسر میرٹھی	۹۶

نگار

جلد ۲ ستمبر ۱۹۳۱ء شمارہ ۳

مُلاحِظاتْ

آئیے آج کی صحبت میں، اپنے ملک کے شاعروں سے کچھ باتیں کر لیں۔

مکہ کی ایک نوجوان لڑکی مدینہ آتی ہے اور سُنتی ہے کہ "عمر بن ابی ربیعہ" کا انتقال ہو گیا ـــــ واضح رہے کہ جرمنی کے شاعر "شیلر" کی طرح عمر بن ابی ربیعہ بھی صرف "عورتوں کا شاعر" کہلاتا تھا، اس نے اپنی ساری عمر اس جمیل و نازک جنس کی مدح و توصیف میں بسر کر دی تھی اور عرب کی کوئی عورت ایسی نہ تھی جو اس کے شعر کی دیوانہ نہ ہو ـــ ہاں، تو جب اس لڑکی کو ابن ابی ربیعہ کی موت کا حال معلوم ہوا تو بُری طرح رونے پیٹنے لگی، اور عربوں کی رسم کے مطابق اپنے نالہ و شیون سے اس نے گویا صفِ ماتم بچھا دی۔ وہ روتی تھی اور کہتی جاتی تھی۔ کہ اب کون ہے جو ہماری جنس کے حسن و جمال کا راگ گائے گا۔ وہ سینہ کوبی کرتی تھی۔ اور چیخ چیخ کر کہتی جاتی تھی کہ اب کون ہے جو ہمارے صنف کی رعنائیوں اور دلربائیوں کی توصیف کرے گا

لوگ جمع ہو گئے اور اس سے کہا کہ اسقدر غم نہ کر، عثمان بن عفان کا ایک پوتا موجود ہے۔ جو ابن ابی ربیعہ کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ وہ اس کمی کو پورا کرے گا" اس لڑکی نے یہ سنکر لوگوں سے کہا کہ "اس کا کوئی شعر تو مجھے سناؤ"

جب لوگوں نے اس کے اشعار سنائے تو اُس نے آنکھیں پونچھیں اور مسکرا کر بولی "خدا کا شکر ہے کہ وہ اپنی یادگار قائم کئے بغیر اس دنیا سے نہیں گیا۔"

کیا ہزاروں میل کا طول و عرض رکھنے والے ہندوستان میں، سیکڑوں سال کی تاریخ شاعری میں سے کوئی ایک ایسا شاعر بھی بتایا جا سکتا ہے۔ جس کے مزار پر محض اس کی شاعری کی وجہ سے کسی عورت نے دو پھول چڑھانے کی بھی زحمت گوارا کی ہو ــــ یہ امر یہاں خارج از بحث ہے کہ اس سرزمین کی عورت ہی ان جذبات کی پرورش کرنے کی اہل نہیں ہے یا یہ کہ فی الحقیقت یہاں کوئی شاعر ایسا پیدا ہی نہیں ہو سکتا

جاہلیتہ اور اوائل اسلام میں عورت و مرد دونوں آزادی سے باہم ملتے جُلتے تھے، محافل و مجالس میں دونوں شرکت کرتے تھے، تبادلۂ نظر کے ساتھ، تبادلہ جذبات و خیالات میں بھی آزاد تھے۔ اور ان کی قومی فطرت، ملکی افتاد اور معاشری خصوصیت کے لحاظ سے یہ میل جول خطرہ سے خالی ہوا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ حطیم کعبہ میں بھی دونوں دوش بدوش نظر آتے تھے۔ اور طواف میں بھی ایک کا شانہ دوسرے کے شانہ سے رگڑ کھاتا تھا۔ جب ان میں تمدنی ترقی کے ساتھ ساتھ امارت و خودداری، غیرت اخلاق و تفریق مراتب کا جذبہ پیدا ہوا تو خلفاء و امراء نے ایک کو دوسرے سے جُدا کر دیا لیکن اس کی ابتدا کیونکر ہوئی۔ یہ واقعہ بھی سننے کے قابل ہے ــــ سلیمان بن عبد الملک اموی کے خلافت کا زمانہ ہے، خالد بن عبد اللہ القسری مکہ کا سردار ہے۔ کہ اس کے کانوں تک کسی شاعر کے یہ اشعار پہونچتے ہیں :-

یا حبذا الموسم من موقف   وحبذا الکعبۃ من مسجد
وحبذا اللاتی یزاحمننا   عند استلام الحجر الاسود

(کیسا پیارا ہے یہ موسم، کیسی پیاری ہے مسجد کعبہ اور کیسی پیاری ہیں وہ عورتیں جو حجر اسود کو بوسہ دینے کے وقت ہم کو گھیر لیتی ہیں)

خالد نے یہ اشعار سنکر کہا کہ خیر، اب آیندہ سے وہ تم کو نہیں گھیریں گی۔ اور حکم دیا کہ مرد و عورت میں تفریق کر دی جائے اور سپاہی متعین کر دئے کہ کوڑے مار مار کر دونوں کو علاحدہ کیا جائے۔ چنانچہ یہ جدائی جو اُس وقت قائم ہوئی تھی ابتک باقی ہے اور مرد و عورت دونوں ساتھ مل کر یہ فریضۂ حج ادا نہیں کر سکتے۔ کیا ہندوستان کے ہزاروں شعلہ بیان شاعروں میں سے کسی ایک شاعر کا نام لیا جا سکتا ہے۔ جس کے کلام سے متاثر ہو کر کسی بادشاہ یا میر نے شاعر دینی تو خیر بڑی چیز ہے۔ کسی معمولی رسم و رواج کو بھی بند کر دیا ہو ــــ یہ سوال یہاں پیدا نہیں ہوتا کہ اس ملک کے امراء و سلاطین ہی ایسے بےحس تھے۔ یا یہ کہ کسی شاعر کی زبان میں خدا نے یہ اثر پیدا ہی نہیں کیا

ایک غریب عرب کی تین لڑکیاں ہیں جو شکل و صورت کے لحاظ سے بھی قابل لحاظ نہیں اور ذہن و دماغ کے اعتبار سے بھی لائق اعتنا نہیں، گھر میں اتنا سرمایہ نہیں کہ سب کو بٹھا کر کھلائے، شوہر ملتے نہیں کہ ان کے سپرد کر کے اس مصیبت سے نجات پائے۔ مجبوراً وہ ایک شاعر (اعشی) کے پاس جاتا ہے اور اپنی داستان غم سناتا ہے۔ یہ فوراً اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور سوق عکاظ میں جا کر ایک قصیدہ ان لڑکیوں کی تعریف میں سناتا ہے۔ جس کا پہلا شعر یہ ہے:

لعمري لقد لاحت عيون كثيرة

الى ضوء نار باليفاع تحرق

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شاعر قصیدہ ختم بھی نہیں کر چکتا کہ تینوں لڑکیاں شوہر حاصل کر لیتی ہیں

ایک طرف ان کی مدح و توصیف کا یہ اثر ہے اور دوسری طرف ان کی ہجو و مذمت کا وہ رعب کہ خلیفۂ وقت بھی ہزار درہم دے کر ایک شاعر سے اس کی ہجو خریدنے پر مجبور ہو جاتا ہے

کیا ہمارے یہاں کے شعراء میں سے کسی ایک قصیدہ گو، کا نام ایسا بتایا جا سکتا ہے۔ جس نے، کسی اور کا تو خیر کیا ذکر ہے، خود اپنے ہی لئے کوئی بہتر رشتۂ ازدواج اپنی شاعری سے پیدا کیا ہو ——— یہ بحث بیکار ہے۔ کہ یہاں کی آبادی ہی اثرات مدح و ذم کے قبول کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی یا یہ کہ خود ہمیں دوسروں کو متاثر کرنے کا سلیقہ حاصل نہیں۔

عراق کا ایک تاجر مدینہ آتا ہے اور جتنے نقاب اس کے پاس ہیں سب فروخت کر دیتا ہے، صرف سیاہ نقاب باقی رہ جاتے ہیں۔ جن کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یہ مسکین الدارمی شاعر کے پاس گیا جو کسی وقت اپنی عیش پرستیوں اور رنگ رلیوں کی وجہ سے بہت مشہور تھا۔ لیکن اب تائب ہو کر مسجد میں زاویہ نشین ہو گیا تھا۔ مسکین الدارمی نے کہا کہ میں کیا تیری مدد کر سکتا ہوں۔ تاجر نے کہا کہ "جس طرح ممکن ہو کوئی نہ کوئی تدبیر نکالئے ورنہ میرا تمام مال پڑا رہیگا۔ اور مجھے سخت نقصان ہوگا۔" مسکین الدارمی نے تھوڑی دیر تامل کیا۔ اور پھر اپنا لباس زہد و تقویٰ اتار کر وہی رندانہ وضع اختیار کی۔ اس حال میں وہ مسجد سے باہر آگیا۔ اور اپنے ایک دوست کو یہ تین شعر یاد کرا کے کہا کہ شہر کے مغنیوں کو جا کر سنا دو:-

قل للمليحة في الخمار الاسود ماذا فعلت براهب متعبد

قد كان شمر للصلاة ثيابه حتى خطرت له بباب المسجد

ردي عليه صلاته وصيامه لا تقتليه بحق دين محمد

(اس معشوقہ ملیح رنگ سے جو سیاہ نقاب ڈالے ہوئے ہے کہہ دو کہ یہ تو نے ایک فقیر گوشہ نشین کا کیا حال کر دیا۔ وہ تو اپنا دامن سمیٹ کر عبادت کے لئے ایک گوشۂ مسجد میں بیٹھ رہا تھا کہ تو دفعتہً سامنے آگئی اور نماز روزہ سب غارت کر کے رکھ دیا۔ پھر اے حسینہ تجھے واسطہ ہے دین محمد کا، کہیں ایسا نہ کرنا کہ تو اس کو قتل کر دے۔)

جس وقت یہ اشعار مدینہ کے گلی کوچوں میں پہونچے تو سب کو یقین ہوگیا کہ دارمی واقعی کسی سیاہ نقاب والی پر عاشق ہوکر مسجد سے باہر آگیا ہے۔اور تمام مدینہ میں کوئی ملیح رنگ لڑکی ایسی نہ رہ گئی جسنے اس تاجر سے سیاہ نقاب خرید کر اپنے چہرہ پر نہ ڈالا ہو۔اس کے بعد سے سیاہ نقاب اس وقت کے فیشن میں داخل ہوگیا

کیا ہندوستان کے بے شمار شاعروں میں کوئی ایک ایسا پیش کیا جاسکتا ہے۔جس کے کلام سے متاثر ہوکر کسی ایک ہی شخص نے کوئی جدید وضع اختیار کر لی ہو ——— یہاں بھی اس گفتگو کا موقعہ نہیں کہ اس ملک کی آب و ہوا خود اس جوشش کی پیداوار کی منافی ہے۔یا یہ کہ یہاں کا شاعر خود اس کیفیت سے معرا ہوتا ہے

ہشام بن عبدالملک کی خلافت کا زمانہ ہے۔اور خالد القسری عراق و خراسان کا حاکم ہے۔اسوقت تک عام دستور تھا۔کہ مسجدوں میں بلند مینار ہوتے تھے۔اور ان پر کھڑے ہوکر موذن اذان دیا کرتے تھے۔ اتفاق سے خالد کے کانوں تک کسی شاعر کے یہ اشعار پہونچ گئے:

لیتنی فی المؤذنین حیاتی انهم یبصرون من فی السطوح
فیشیرون او تشیر الیهم بالهوی کل ذات دل ملیح

(کاش میں بھی ان موذنوں میں سے ہوتا جو اونچے مناروں پر کھڑے ہوکر آس پاس کے چھتوں پر نگاہ ڈالتے ہیں اور وہیں سے عشوہ طراز ملیح لڑکیوں سے اشارہ بازی کرتے ہیں۔)

ان اشعار کے سننے کے بعد ہی خالد نے حکم دیا کہ تمام مساجد کے مینار منہدم کردیے جائیں

کیا ہندوستان کی تاریخ میں بھی کوئی واقعہ ایسا ملتا ہے۔کہ کسی شاعر کے کلام نے انہدام مسجد و مینار تو تیر بڑی بات ہے کسی محراب میں ایک پردہ ہی کا اضافہ کردیا ہو ——— یہ عذر اس جگہ قابل سماعت نہیں کہ اس کا سبب ملک کی غیرت دینی کا فقدان ہے یا خود شاعر کی بے اثر زبان

امیر معاویہ مصروف جنگ ہیں اور دشمن کے ہجوم نے اسقدر تنگ کردیا ہے کہ سوائے فرار کے کوئی صورت نظر نہیں آتی۔لیکن ٹھیک اس وقت ابن الاطنابہ انصاری کا یہ شعر ان کے کانوں تک پہونچتا ہے:

ابت لی عفتی وابی بلائی
واخذی الحمد بالثمن الربیح

اور وہ نئے جوش و خروش کے ساتھ حملہ کرکے دشمن کو شکست دیتے ہیں۔

رشید کو جس چیز نے نقفور ملک روم کے خلاف جنگ کرنے پر آمادہ کیا۔وہ صرف ایک یہ شعر تھا:

غدر اللذی عطاک نفور فعلیہ دائرۃ البوار تدور

خلیفہ سفاح ستر امراء بنی امیہ کیساتھ بیٹھا ہوا، کھانے کا انتظار کر رہا ہو کہ دفعتہً ایک شاعر اندر آتا ہے اور مظالم بنی امیہ کا ذکر کر کے یہ شعر پڑھتا ہے:-

اذکروا مصرع الحسین و زید وقتیلاً بجانب المھراس

سفاح یہ سنتے ہی برہم ہو جاتا ہے اور تمام امراء بنی امیہ کو قتل کرا دیتا ہے

ایکبار اسی خلیفہ سفاح کے پاس سلیمان بن ہشام اموی بیٹھا ہوتا ہے کہ سدیف شاعر آتا ہے اور کہتا ہے:

لا یغرنک ماتری من رجال ان تحت الضلوع داء دویا

فضع السیف وارفع السوط حتی لا تری فوق ظہرہا امویا

نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سفاح فوراً سلیمان کو قتل کرا دیتا ہے

رشید مالک بن طوق کے قتل کا حکم دیتا ہے۔ جس وقت جلاد اس کو قتل کیلئے سامنے لاتا ہے اور گردن جھکا دیتا ہے۔ تو اس کی زبان سے یہ اشعار نکلتے ہیں:

اری الموت بین النطع والسیف کامناً یلاحظنی من حیثما اتلفت

وما بی من خوف اموت واننی لا علم ان الموت شئی موقت

ولکن خوفی صبیۃ قد ترکتہم واکبادہم من حسرۃ تتفتت

رشید رونے لگتا ہے اور کہتا ہے کہ "میں نے تیری لڑکی کا صدقہ تجھے معاف کر دیا۔ جا اور اب پھر لوٹ کر یہاں نہ آنا"

عرب میں قبیلہ نمیر نہایت ہی معزز قبیلہ سمجھا جاتا تھا۔ اور اس قبیلہ کے افراد نہایت فخر و غرور سے اپنی نسبت اس قبیلہ سے ظاہر کرتے تھے، لیکن جب شاعر جریر نے اس قبیلہ کی ہجو میں یہ شعر کہا کہ

فغض الطرف انک من نمیر فلا کعبا بلغت ولا کلابا

تو تمام ملک میں رسوائی کا یہ عالم ہو گیا کہ اگر لوگ اس قبیلہ کے کسی آدمی سے اسکا نام پوچھتے تو وہ نمیر کا نام چھوڑ کر کسی اوپر کی پشتوں کے نام بتاتا یہاں تک کہ آخر کار اس قبیلہ کا نام ہی دنیا سے محو ہو گیا

تاریخ شعر عرب اس قسم کے واقعات سے لبریز ہے۔ لیکن میں دریافت کرتا ہوں کہ کیا ہندوستان میں بھی کوئی شاعر ایسا ہوا ہے جسنے ہمارے مصالح دینی، ہمارے روایات اخلاقی اور ہمارے شعائر قومی و ملی پر کوئی ہلکے سے ہلکا اثر چھوڑا ہو ۔۔۔۔ پھر جب میرے ان تمام سوالوں کا جواب نفی میں دیا جاتا ہے تو خدا کیلئے مجھے بتایا جائے کہ اس بادہ گوئی، اس ژاژخائی، اس وقت ضائع کرنا کیا معنی رکھتا ہے

غالب کا ایک شعر ہے ؎

حیف کہ من بہ خوں تپم ورز تو خوں بود کہ تو اشک بدیدہ نشمری نالہ بہ سینہ بنگری

شاعر نے تو اسے اپنے مخصوص حالات محبت کے لحاظ سے کہا ہوگا۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ اثر و نتیجہ کے لحاظ سے ہندوستان کے ہر شاعر پر فرداً فرداً شاید ہی کوئی شعر اس سے بہتر طور پر منطبق ہو سکے

ہر ملک کی آب و ہوا کا خاص اثر ہوتا ہے، ہر قوم کی سیاسیات کا مخصوص اقتضا ہوتا ہے اور ہر سرزمین اپنی معیشت و معاشرت کے ماحول کے لحاظ سے ذہن انسانی کی تربیت کرتی ہے۔ ہندوستان جو ہمیشہ سے غیر ملکی تاخت کا مرکز بنا رہا یقیناً یہاں کے لوگوں میں کوئی جذبۂ حماست پیدا نہیں کر سکتا تھا، اس لئے شاعری کا یہ قربانی عنصر جو دنیا میں انسان کو سکندر و بنی بال بنانے میں مدد دیتا ہے یوں ختم ہو گیا، لیکن مغلوبیت و مظلومیت سے جو کیفیت پیدا ہو سکتی تھی وہ ضرور انتہا کو پہونچ گئی۔ اور یہ نکبت و ذلت، انحطاط و ادبار قومی زندگی کا ایک ضروری جزو ہو کر رہ گیا حتیٰ کہ یہاں کا بہترین تغزل وہی مانا گیا جس میں سب سے زیادہ یاس و حرماں کا اظہار تھا۔ چنانچہ میر کو خدائے متغزلین کہنے کی علت یہی ہے کہ ان سے زیادہ کسی نے اپنی بیکسی و بیچارگی، محرومی و مایوسی کا اظہار نہیں کیا۔ یہاں کی حماسی شاعری کا بڑا سرمایہ مراثی کی صورت میں پیش کیا جا سکتا ہے، لیکن آپ کسی بہترین مرثیہ گو کا کلام اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ اس کا قابل ذکر حصہ وہی ہے جہاں اس نے فریاد و شیون سے کام لیا ہے۔ ورنہ جہاں اس نے جوش مردانہ سے کام لینے کی کوشش کی وہیں وہ منہ کے بل آ رہا۔ یہاں تک کہ اگر وہ تلوار و اسپ کی تعریف کرتا ہے تو اس طرح گویا کسی عروس کا حال بیان ہو رہا ہے۔ اور جب وہ حرب و دفاع کا بیان کرتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ بٹیروں کی پالی کا ذکر ہو رہا ہے۔

آپ مراثی کا تمام ذخیرہ ڈھونڈھ ڈالئے۔ لیکن آپ کو عربی کے اس ایک شعر کا بھی جواب کہیں نہ ملے گا۔

کان مثار النقع فوق رؤسنا واسیافنا لیل تھاوی کواکبہ

(یعنی میدان جنگ میں جو گرد و غبار سروں پر اٹ کر رہ گیا تھا تو اس میں تلواروں کی چمک ایسی نظر آتی تھی جیسے رات کو ستارے ٹوٹ رہے ہیں۔)

اس کا سبب یہ ہے کہ وہاں کے لوگ جنگ کی حقیقت سے واقف تھے، قبائلی غیرت و خودداری ان کو ہمیشہ حرب و دفاع کے لئے آمادہ رکھتی تھی۔ اور یہ وہاں روز کا منظر تھا کہ اگر کوئی عورت وا تغلباہ کہہ کر ایکبار چیخ پڑی، تو سارا قبیلہ تلواریں سوت سوت کر باہر آ گیا۔ اور جب تک انتقام نہیں لے لیا واپس نہیں گئے۔ پھر یہی وہ حقیقت تھی جو اُن سے یہ شعر کہلوا دیتی تھی کہ

فالوا بالرماح مکسرات وابنا بالسیوف قد انحینا

(وہ لوگ واپس گئے اس طرح کہ ان کے نیزے ٹوٹے ہوئے تھے اور ہم واپس ہوئے اس حال میں کہ ہماری تلواریں خم ہو گئی تھیں)

اور اسی حقیقت کا فقدان تھا جو ہندوستان میں حماسی شاعری کو پیدا نہیں کر سکا حالانکہ اصل چیز یہی ہے

یہاں غزلگوئی کی کثرت رواج کا سبب یہی ہوا کہ اس صنف سخن میں پوری طرح جی کھول کر درد و کرب کا بیان ہو سکتا ہے، اور اس میں کلام نہیں کہ اس لحاظ سے یہاں کی قنوطی شاعری کا مقابلہ کوئی دوسری زبان مشکل سے کر سکتی ہے لیکن سوال

یہ ہے کہ اس سے ایک ایک یا قوم کو کیا فائدہ پہونچ سکتا ہے۔ اس سے اتنا فائدہ تو ضرور ہے کہ ایک شخص اپنے مصائب جھیلنے کے لئے زیادہ صبر سے کام لینا سیکھ جاتا ہے۔ اور اگر بستر مرگ پر ہے تو جان ذرا اچھی طرح دے سکتا ہے۔ لیکن کیا شاعری کا انتہائی مقصود یہی ہونا چاہئے۔ اور صرف اسی لئے اس کو اختیار کرنا چاہئے کہ ملک میں ایک جماعت "احدیوں" اور "مرٹ جیروں" کی پیدا ہو جائے۔

اس وقت ملک جس دور سے گزر رہا ہے وہ یقیناً نہضت وارتقار کا آغاز ہے۔ جس کی بنیاد سیاسی انقلاب پر قائم ہوئی ہے، اس لئے ہمارے شعرار کا ایسے زمانہ میں صرف "ہائے، وائے" کی آواز بلند کرنا۔ ملک کے مقاصد کو نقصان پہونچانا ہے ضرورت ہے کہ لوگوں میں ان کی پستی ونکبت کا احساس پیدا کر کے، انسانی غیرت وخودداری کو ابھارا جائے۔ اور چند دنوں کے لئے اس عشقبازی کو ترک کر دیا جائے۔ جس کا مدعی تو یہاں کا ہر شاعر ہے، لیکن عامل کوئی نہیں۔

میں غزل گو حضرات کی توہین نہیں کرتا۔ اور نہ ان کی اہمیت کو کسی طرح کم کرنا چاہتا ہوں۔ بلکہ مدعا صرف یہ کہنا ہے کہ غزل گوئی کا صحیح زمانہ ایک قوم پر اس وقت آتا ہے۔ جب وہ انتہائی نکبت وذلت تک پہونچ جائے، یا انتہائی عروج وارتقا کی حالت میں ہو۔ لیکن ان دونوں زمانوں میں بھی اس کی افادیت مشتبہ ہے۔ کیونکہ زوال کے دور میں وہ فنا کے حدود سے قریب تر کرنے والی ہوتی ہے۔ اور عروج کے زمانہ میں زوال کی خبر دینے والی۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس فطری استعداد وقوت سے کوئی بہتر کام نہ لیا جائے۔ اور وہ ملکہ شعر جو صرف غزل گوئی میں صرف کیا جاتا ہے، ملک و قوم کی فلاح واصلاح کے لئے استعمال نہ کیا جائے۔

کیا وہ ہاتھ جو ماتم کے لئے اٹھتے ہیں۔ اُن ہاتھوں سے جدا ہوتے ہیں، جو تیغ وتبر کا وزن اٹھاتے ہیں۔ جب گھر میں آگ لگتی ہے تو اہل تدبیر گریہ وزاری میں وقت صرف نہیں کرتے بلکہ پانی فراہم کرنے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں۔ پھر کیا ہندوستان کے لئے اس سے زیادہ نازک وقت کوئی اور آنے والا ہے۔ جب ہم اس کی خدمت کے لئے آمادہ ہونگے۔ اور کیا ہمارے شعراء پر مادر وطن کا کوئی حق نہیں ہے۔ جو ایسے نازک وقت میں اُن سے طلب کیا جائے۔

اس وقت سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے اور جو مسلمانوں میں تقریباً مفقود ہے۔ وہ جذبۂ وطنیت ہے۔ اس لئے یہ ساعت زلف وعارض کے ذکر کی نہیں ہے۔ بلکہ اُس غیرت وخودداری کو بیدار کرنے کی ہے۔ جس کے فقدان نے ہم کو دنیا میں ذلیل ورسوا کر رکھا ہے۔

افسوس ہے کہ شاعری کے ذکر نے ملاحظات میں کسی اور اظہار خیال کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی اور بعض ایسے سیاسی مسائل جنکا ذکر ضروری تھا رہ گئے۔ کوشش کروں گا کہ ماہ آیندہ میں اس کی تلافی ہو سکے ———

میں ستمبر کے اول ہفتہ میں کشمیر جا رہا ہوں تاکہ وہاں کے موجودہ اضطراب کا مطالعہ کر کے ان دو متضاد بیانوں پر تنقید کر سکوں۔ جو حکومت وپبلک کی طرف سے شائع ہو رہے ہیں

—— نیاز ——

مطالعۂ حدیث تنقید صحیح کی روشنی مین

ایامِ صیام

مذاہب مین روزہ کسی طبی اصول کو مدنظر رکھ کر فرض نہین کیا گیا اور نہ درحقیقت روزہ رکھنے سے مذہب کا خیال اصلاح معدہ تھا اس سے مقصود محض امتثال امر ربانی ہے اور مذہب کی ایک عظیم الشان یادگار کو ہر سال تازہ کرنا ورنہ ظاہر ہے کہ نہ انسان بھوکا رہ کر خدا پر کوئی احسان کرتا ہے اور نہ بزعم صوفیہ اس سے روحانیت پیدا ہوتی ہے اسلام ایسی روحانیت یا رہبانیت کا قائل نہین اگر بھوکا رہنے سے معدے پر کوئی اچھا اثر پڑتا ہے تو وہ ایک اتفاقیہ نتیجہ ہے ورنہ جہان تک مسلمانون کے روزے کا تعلق ہے یہ فائدہ مدنظر نہین، اسلام مین روزے کی غرض وغایت اس قدر ہے کہ خدانے ایک حکم دے کر ہماری آزمایش کی ہے کہ ہم کس قدر اس کے حکم کی تعمیل کرکے اس کے وجود کا اقرار عملی طور سے کرتے ہین مگر چونکہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے یا یہ سمجھو کہ وہ انسان کی اس عادت کو جانتا ہے کہ بندہ ہر امر کی علت وغایت پر کج بحثی کرنے لگتا ہے اس لیے روزے کا یہ سبب بتا دیا کہ وہ اسلام کی اس عظیم الشان واقعہ کی یاد تازہ کرتا ہے جب کہ خدانے قرآن کو انسان پر نازل کیا،

قبل اس کے کہ مین اس مضمون پر کچھ لکھون یہان ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے بعضونکا خیال ہے کہ مین حدیث کی مخالفت اس وجہ سے کرتا ہون کہ اس مین اکثر یہودیت کی تقلید ہے لیکن یہ الزام میرے اوپر غلط ہے کیونکہ مین نے یہ کبھی نہین کہا کہ حدیث کی بعض باتین یہودیون کے احکام سے ملتی ہین اور اس واسطے وہ یہودیون سے لی گئی ہین، مین تو یہود ونصاریٰ کے مذاہب کو خود ایسی ہی مسخ شدہ صورت سمجھتا ہون جیسی اہلِ فقہ وحدیث کے اسلام کی ہے بلکہ میرا کہنا یہ ہے کہ قرآن کے بہت سے احکام یہود کے مسائل کی روشنی مین بخوبی جانچے جاسکتے ہین یعنی میرے نزدیک اہلِ اسلام کا معیار قرآن ہے، اگر قرآن کی تائید مین توریت، انجیل وحدیث سے توہم کو قرآن کے معنی سمجھنے مین بے انتہا مدد ملتی ہے اور اگر اس کی تائید مین قرآن نہین ہے تو میرے نزدیک

وہ سب اختراعی باتین ہین، یقیناً قرآن نے جو اسلام پیش کیا ہے یہی اسلام یہود و نصاریٰ پر پہلے پیش کیا گیا تھا اور یہود و نصاریٰ مین جو باتین قرآن کی تائید مین ہین وہی دراصل ان نوشتون مین الہامی تھین ورنہ باقی الحاقی لیکن اگر احکام شریعت و قصص انبیاء مین یہود ایسی باتین بیان کرتے ہین جو قرآن مین مذکور نہین یا اس کے برخلاف ہین اور بالکل وہی باتین حدیث مین پائی جاتی ہین تو اس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حدیث نے وہ باتین براہ راست یہود سے لین لیکن برخلاف اس کے اگر قرآن کے احکام کی تائید یہود و نصاریٰ کے نوشتون سے ہوتی ہے اور اسکے خلاف حدیث مین ہے تو ہم حدیث کی تردید مین قرآن کا بیان کافی نہ سمجھین گے بلکہ ہم کو یہ بھی کہنے کا حق ہوگا کہ قرآن کے جو معنے صحیح ہین وہ وہی ہین جو قرآن کی عبارت سے ظاہر ہین اور یہی یہود کے نوشتون مین بھی ہین، اس لیے یقیناً قرآن کے جو معنی حدیث نے لیے ہین وہ صحیح نہین اس کی دو مثالین خود آیت صیام مین مل سکتی ہین،

یہود مین افطار کا وقت رات کا ہوتا تھا جب کہ آسمان پر تارے نکل آتے تھے اور روزہ اُس وقت سے رکھا جاتا تھا جب کہ وہ سفید تاگے کو سیاہ تاگے سے پہچان لیتے تھے، قرآن کے الفاظ بالکل صاف ہین جو اس طریقہ کی تائید کرتے ہین:-

(۱) ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ	پھر رات تک روزہ پورا کرو
(۲) وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ	اور کھاؤ اور پیو یہان تک کہ کالا تاگہ سفید تاگے سے صبح (کے سبب سے) دکھلائی دینے لگے

باوجودیکہ مسلمانون ہی مین ایک فرقہ یعنی اہل تشیع کا قرآن کے صاف الفاظ کی پیروی کرتا ہے لیکن سنی لوگ ایک پر تو بالکل عمل ہی نہین کرتے اور دوسرے کے معنی غلط لیتے ہین اور غضب یہ ہے کہ دونون امور کی تائید مین حدیثین لاتے ہین، ظاہر ہے کہ ایسی حدیثین قبول نہین ہوسکتین ہر شخص جس کو ذراسی عربی آتی ہے وہ لیل کے معنی وہی سمجھے گا جب کہ خوب رات ہو کر ستارے نکل آئین، شام یا مغرب کے وقت پر لیل کبھی بولا نہین جاتا اسی طرح خیط ابیض و خیط اسود سے رات کی سیاہی اور صبح کی سفیدی مراد لیتے ہین اور اس کی تائید مین ایک دو روایتین بھی پیدا کر دی ہین:-

مثلاً سہل بن سعد سے روایت ہے کہ جب آیت کلوا واشربوا حتے یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود نازل ہوئی تو لوگ روزہ رکھنے کا ارادہ کرتے وقت رات کو اپنے پاؤن مین سفید اور سیاہ ڈورے لپیٹ لیتے تھے اور کھاتے پیتے رہتے تاوقتے کہ ان دونون مین تمیز ہونے لگتی۔ (صحیحین)

یہان تک تو غنیمت تھا کیونکہ یہ وہی بات تھی جو قرآن کا مدعا تھا، مگر عدی بن حاتم کی روایت دیکھو جو مسلم مین ہے عدی بن حاتم نے دو رسے اونٹ باندھنے کے ایک سفید اور ایک سیاہ اپنے تکیے کے نیچے رکھے

اور جب رات کا کچھ حصہ باقی رہ گیا تو ان کو دیکھنے لگے مگر کچھ تمیز نہ کر سکے جب صبح ہوئی تو رسول اللہ صلعم کی خدمت مین حاضر ہو کر عرض کیا کہ مین نے اپنے تکیے کے نیچے خیطِ ابیض و خیطِ اسود رکھے تھے مگر کچھ تمیز نہ کر سکا، آپ نے فرمایا بے شک اگر تمھارے تکیے کے نیچے خیطِ ابیض و خیطِ اسود آ گئے تو تمھارا تکیہ ضرور بڑا لمبا ہو گا ایک نے عرض کیا یا رسول اللہ خیطِ ابیض و خیطِ اسود کیا ہے کیا وہ ڈورے نہین ہین، آپ نے فرمایا تمھاری گردن ضرور بڑی لمبی ہو گی کہ تم نے دونون خیط دیکھ لیے اس کے بعد آپ نے فرمایا نہین بلکہ اس سے رات کی سیاہی اور دن کی سفیدی مراد ہے

کیا یہ حدیث قرآن کی تائید واقعی کر رہی ہے مین نے آج تک کبھی آسمان پر سفید و سیاہ دھاری بنتے نہین دیکھی اور اگر بنتی ہو گی تو عرب کے آسمان کے لیے مخصوص ہو گی وہان کی فضا خشک آب و ہوا کی وجہ سے نہایت صاف و شفاف ہوتی ہے مگر جن ممالک مین صبح کے وقت کہر ابر تا ہے اور آسمان کو کوئی آٹھ بجے دن تک نہین دیکھ سکتا وہان اس پر کیسے عمل ہو سکتا ہے، مین نے اکثر ممالک کی سیاحت کی ہے عراق و عجم مین بھی صبح کے وقت یہ خطوط نظر نہین آتے اب بتائیے کہ اگر قرآن کا یہ مطلب ہے تو بالکل فضول بات کہی گئی اور یا پھر اس سے یہ مراد لی جائے کہ جب خوب دھوپ نکل آئے اور کہر اغائب ہو جائے اس وقت تک آدمی کھائے پیے مگر قرآن کسی عجمی کی بنائی حدیث نہین ہے، اس نے وہی طریقہ روزے کے شروع کرنے کا بتایا ہے جو یہود کو بتایا تھا اور اس زمانے مین بجائے اس کے ہمارے لیے گھڑیال ہے جو وہی سفید و سیاہ تاگے کے معنی کو پورا کر رہا ہے سمجھ مین نہین آتا کہ قرآن کی عبارت مین کیا پیچ تھا جو اس کی اس طرح تاویل کی گئی۔

اسی طرح قرآن کے بہت سے الفاظ ہین جن کی لغو تاویل کی جاتی ہے جس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ حدیث رسول اللہ صلعم کا قول تو درکنار کسی اہل زبان کا بھی قول نہین ہے مثلاً کشف الساق کی حدیث ملاحظہ کرو یا ابن عباس کے غسل رجلین والی حدیث کو جس مین کھلی ہوئی غلطی موجود ہے۔

قبل نزول قرآن سب سے بڑی یادگار کا وہ دن سمجھا جاتا تھا جبکہ بنی اسرائیل نے فرعون کے جبر و استبداد سے نجات پائی تھی اور اسی لیے یہود مین تشریق یعنی ساتوین مہینے کی دسوین تاریخ کو ایک روزہ اس یادگار مین رکھا جاتا تھا، کہا جاتا ہے کہ جب رسول اللہ صلعم مدینے تشریف لائے تو آپ نے فرمایا کہ ہمکو یہود سے زیادہ اس کا حق ہے کہ اس روزے کو رکھین، اور آپ نے یہ روزہ رکھا مگر یہ بات بالکل صحیح ہے کہ ہجرت کے دوسرے سال آپ پر وہ احکام صیام نازل ہوے جو سورۂ بقر کے ۲۳ رکوع مین بالتفصیل درج ہین انکا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانون کو رمضان کے چند دنون مین روزے رکھنے کا حکم دیا گیا ہے جیسے ان سے پہلے کے مسلمانون کو دیا گیا تھا، تاکہ وہ لوگ خدا کے حکم کی تعمیل سے یہ ظاہر کرین کہ وہ خدا سے ڈرتے ہین، مریض و مسافر اپنے روزہ کی قضا دوسرے دنون مین پوری کر لین اور جو مریض و مسافر صاحبِ استطاعت بھی ہون وہ رمضان کے ایام صیام مین

فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلا کر دے سکتے ہیں اور اس کے ساتھ قضا رکھیں تو اچھا ہے اور نہ رکھیں تو یہ فدیہ کافی ہے اگر مسلمان معتکف ہو تو رات کو اپنی بیوی سے مباشرت کر سکتا ہے ورنہ نہیں

اس مضمون میں مجھے صرف ایام صیام سے بحث کرنا ہے، سب سے پہلے قرآن کی وہ آیت جس میں روزے کے دنوں کی تعیین کی گئی ہے قابل غور ہے

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ - اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ	مسلمانو! جس طرح تم سے پہلے اہل کتاب پر روزہ رکھنا فرض تھا تم پر بھی فرض کیا گیا تاکہ تم خدا سے ڈرو۔ گنتی کے چند روز ہیں۔

اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ" کے کیا معنی گنتی کے چند روز اگر تم کو عربی آتی ہے تو غالباً تم جانتے ہو گے کہ ایام بر وزن افعال جمع ہے یوم کی اور یہ جمع قلت ہے یعنی وہ جمع تعداد میں ڈھائی سے نہ بڑھے اگر اہل عرب سے ملنے کا اتفاق ہو تو تم کبھی کسی عرب کو ثلاثین ایام کہتے ہوئے نہ سنو گے یا عشرین یا خمسین ایام یعنی ۳ سے ۹ دن تک تو یوم کی جمع ایام بول سکتے ہیں اس کے آگے اہل نجد کو تو میں نے بولتے ہوئے نہیں سنا، اہل حجاز و مصر کو البتہ میں نے تیس سے کم کے اعداد پر ایام لاتے ہوئے سنا ہے مگر ان کی عربی سوقی ہے مستند نہیں ہو سکتی، واقعہ یہ ہے کہ جس طرح ہمارے یہاں سات دن کو ہفتہ اور تیس دن کو مہینہ کہتے ہیں ایسے ہی عرب میں بھی بولا جاتا ہے لیکن جب ایاما معدودات ہے تو پھر وہ کسی طرح ۳ سے کم اور ۹ سے زیادہ پر بولا ہی نہیں جاتا۔ خود قرآن شریف میں بھی اکثر جگہ ایاما معدودات آیا ہے۔ اور وہاں اس سے تین دن مراد لیے گئے۔

یہود کا یہ پرانا عقیدہ تھا کہ ان کی قوم تین دن سے زیادہ دوزخ میں نہ رہے گی، حضرت مسیح کی نسبت بھی کہا جاتا ہے کہ وہ تین دن دوزخ میں رہے۔ قرآن میں آیا ہے

وقالوا لن تمسنا النار الا ایاما معدودۃ (بقرہ - ۸)	اور وہ کہتے ہیں کہ ان کو آگ نہ چھوئے گی مگر چند دنوں کے لیے

معلوم نہیں جلالین نے اس کی تفسیر میں چالیس روز کہاں سے پیدا کیے حالانکہ یہود کا عقیدہ ۳ دن کا ہے اور ایاما معدودہ کو چالیس دن کہنا خود غلط ہے، اسی طرح قرآن شریف میں ہے۔

وَاذْکُرُوا اللّٰهَ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ	اور اللہ کو ان تین دنوں میں یاد کرو (جو ایام تشریق کہلاتے ہیں)
فَمَنْ تَعَجَّلَ فِیْ یَوْمَیْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْهِ	اور جو اس سے پہلے دو دن

تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ رمضان[1] کے روزے ابتدا میں تین ہی دن کے فرض تھے اسلیے معلوم ہوا کہ ایاما معدودات سے ۳۰ دن ہرگز نہیں مراد ہو سکتے نہ لغتاً نہ تاریخاً پھر یہ ۳۰ روزے کہاں سے آئے قرآن سے؟ نہیں، قرآن کی جو لوگ سند پیش کرتے ہیں ان کا عروۃ الوثقیٰ یہ آیت ہے۔

---

[1] سیرۃ النبوی علامہ شبلی نعمانی جلد دوم صفحہ ۱۱۶

شہر رمضان الذی انزل فیہ القرآن ھدی للناس وبینت من الھدی والفرقان فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ (بقرہ)

رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل کیا گیا جو لوگوں کا رہنما ہے اور اس میں ہدایت وحق و باطل کی تمیز کے کھلے کھلے حکم ہیں۔ تو تم میں سے جو شخص اس میں موجود ہو تو چاہیے کہ روزہ رکھے

اگر رمضان کے پورے مہینے کا حکم اس آیت میں ہوتا تو یقیناً اس آیت کے بالکل بعد ومن کان مریضاً او علےٰ سفر فعدۃ من ایام اخر میں ایام کا لفظ نہ بولا جاتا بلکہ من شھر اخر بولا جاتا کیونکہ رمضان کے مہینے ہی میں رمضان کی قضا کبھی رکھی نہیں جاتی یہ ضرور ہے کہ شہر رمضان بولا گیا ہے لیکن اس کا تعلق انزل فیہ القرآن سے ہے اور یہ صحیح نہیں کہ قرآن رمضان کی پہلی تاریخ سے جو اترنا شروع ہوا تو عید کے روز تک اترتا رہا۔ قرآن لیلۃ القدر میں نازل ہوا، اور اگر مسلمانوں کو اس یادگار کے قائم کرنے کا کبھی خیال ہوتا تو یقیناً آج اس کی تاریخ میں اختلاف نہ ہوتا فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ کے معنی دو ہی ہو سکتے ہیں ایک جو میں نے اوپر لکھے ہیں یعنی تم میں سے جو شخص اس مہینہ میں موجود ہو تو چاہیے کہ روزے رکھے دوسرے یہ کہ تم میں جو شخص رمضان کا مہینہ یا چاند دیکھے تو روزے رکھے، اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سے لوگ تھے جو رمضان کا چاند نہیں دیکھ سکتے تھے[1] ظاہر ہے کہ یہ مریض و مسافر کیلیے نہیں، مردوں کے لیے نہیں اس لیے تم یہی کہو گے کہ اس سے صرف یہ مراد تھی کہ رمضان کے دنوں کی تعیین کر دی جائے مگر اس کی تعیین نہایت شرح و وضاحت سے پہلے ہی کر دی گئی ہے اور تعیین کے لیے جو جملہ آیا ہے وہ اس خیال وقول کے خلاف ہے، تمہارے پاس صرف یہ جواب ہو سکتا ہے کہ فقہ اور حدیث نے تیس روزے مقرر کیے ہیں اور ہم قرآن کو نہیں جانتے قرآن کا سمجھنا اور اپنی طرف سے معنی پیدا کرنا ہمارے لیے ضلالت و گمراہی اور رجعت الی جہنم[2] ہے جیسا ہم نے حدیث میں پایا جیسا ہمارے فقہانے سمجھا وہی صحیح ہے اگر قرآن میں اس کے خلاف ہے تو وہ حکم منسوخ ہی اس لیے اب ساری بحث دو تنقیحوں پر منحصر رہ جاتی ہے۔

۱۔ آیا قرآن کا پہلا حکم قرآن یا حدیث سے منسوخ ہے،

۲۔ آیا حدیث سے تیس دن کے روزے ثابت ہیں۔

اول کیا قرآن کی پہلی آیت صیام منسوخ ہے؟ میں نے اس موضوع پر علیحدہ معاندت قرآن واہل قرآن کے عنوان سے قرآن کے ناقص، منسوخ اور محروف ہونے پر بحث کی ہے، شان نزول یعنی قرآن کو بالکل ایک وقتی اور موسمی چیز سمجھنا اس پر بھی میں نے اسی مضمون میں بحث کی ہے علمائے اسلام نے تو قرآن کو صرف قرآن ہی کی آیتوں سے منسوخ نہیں مانا ہے، بلکہ حنفیہ کے نزدیک حدیثیں بھی آیت قرآنی کی ناسخ ہو سکتی ہیں اور قرآن کی آیتوں میں آپ کو جہاں دو آیتوں میں

[1] وہ لاپ لینڈ کے رہنے والے ہیں اور میرے نزدیک قرآن کی مراد نہیں ملک کے رہنے والوں سے جہاں طلوع ہلال کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا

[2] من فسر القرآن برایہ فلیتبوا مقعدہ فی النار

ذرا بھی اختلاف ظاہر نظر آیا تو فوراً ایک آیت ناسخ اور دوسری منسوخ سمجھ لی گئی اور اس طرح پچاسون آیتون پر نسخ کا حکم لگا دیا گیا، ابن عربی نے اس تعداد کو کم کر کے اکیس آیتین منسوخ قرار دین اور شاہ ولی اللہ نے پانچ پر اکتفا کی لیکن جو بات ناسخ و منسوخ مین سب سے زیادہ عجیب و غریب ہے وہ یہ ہے کہ قرآن مین ایک ہی عبارت کے اندر ناسخ و منسوخ کو تسلیم کیا جاے اس کے یہ معنی ہوے کہ مبتدا کے جملے مین پہلے ایک حکم دیا گیا اور خبر کے جملے مین مبتدا کے جملے کی تردید کر دی گئی، اگر ناسخ و منسوخ کی یہ صورت مانی جائے تب تو اس مین کوئی شک نہین کہ آیات صیام مین ایام معدودات منسوخ ہے اور فمن شہد منکم الشہر ناسخ ہے مگر غالباً یہ قول قابل اعتماد نہین ہے اور قرآن کے ساتھ اسقدر سخت بے ادبی ہے کہ میرے خیال مین اس عقیدے کا رکھنے والا اپنے کو مسلمان کہلانے کا کوئی حق نہین رکھ سکتا، اور وہ یقیناً نصاریٰ اور غیر مسلم کا ہم نوا ہے اور قرآن کا دشمن ہے، ناسخ و منسوخ کے لیے یہ ضرور فرض کرنا پڑا کہ ایک حکم امت مین کچھ عرصے تک جاری رہا اور جب اس حکم کا تجربہ ہو لیا اور حکم قابل تبدیل نظر آیا تو دوسری آیت سے بدل دیا گیا، گو کہ یہ عقیدہ بھی خداے واحد کے علم و خبر پر سخت حملہ ہے لیکن اس مضحکہ خیز قول سے کہ قرآن ایک ہی جملہ مین اپنی تردید کرتا ہے بدرجہا بہتر ہے،

صیام کی آیتون مین پہلے یہ دیکھو کہ آیا فی الواقع یہ آیتین ایک ساتھ کی ہین یا مختلف زمانون کی ان آیتون کو یا ایھا الذین سے لے کر کذلک یبین اللہ آیاتہ للناس لعلھم یتقون تک خوب غور سے دیکھو تم کو معلوم ہوگا کہ فی الواقع اس مین دو مختلف گر قریب کے اوقات کی آیتین جمع ہین یعنی پہلے وقت کی آیت تو یا ایھا الذین سے شروع ہو کر لعلکم تشکرون پر ختم ہو گئی جس مین ایاماً معدودات و فمن شہد منکم الشھر دونون آگئے، اس کے بعد دوسری بحث واذا سالک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان فلیستجیبوا لی ولیومنوا بی لعلھم یرشدون سے حد فاصل قرار پائی، اور پھر ارشاد ہوتا ہے احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الی نسائکم ھن لباس لکم وانتم لباس لھن علم اللہ انکم کنتم تختانون انفسکم فتاب علیکم وعفا عنکم فالئن باشروھن وابتغوا ما کتب اللہ لکم

آخری آیتون سے بہت سی باتین شک لانے والی پیدا ہوتی ہین، اول تو یہ کہ مسلمانون کو پہلے یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ رمضان کے دنون مین رات کو بھی عورتون سے علحدہ رہین لیکن مسلمانون پر یہ حکم شاق ہوا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو معاف کر دیا، اب پہلا سوال تو یہ ہوگا کہ یہ حکم قرآن مین کہان تھا جس کا قرآن نے یہان حوالہ دیا ہے لیکن چونکہ ایسا حکم کہین نہین ہے اس لیے ماننا پڑے گا کہ قرآن کے احکام مجمل ہوا کرتے تھے رسول اللہ صلعم ان کی صراحت فرما دیا کرتے تھے، جب روزہ فرض کیا گیا تو کسی نے شاید پوچھا کہ رات کو عورتون سے

مباشرت بھی کی جاے حالانکہ اس قسم کے سوال کرنے کی ممانعت مسلمانون کو ہو چکی تھی کیونکہ یہود نے اس قسم کے سوالات پیش کرکے گائے کے ذبح کرنے مین حجتین پیدا کی تھین اور اسی لیے آن حضرت نے ان کو تادیبًا فضول سوالات سے منع کر دیا، یہود کا قاعدہ تھا کہ وہ روزے کی راتون مین اپنی بیویون سے علحدہ رہتے تھے مسلمانونکو روزہ رکھنے مین یہود کا طریقہ بطور نمونے کے ملا انھون نے بھی رات کو بیویون سے علحدہ رہنا شروع کیا، اور چونکہ عرب مباشرت پر بہت حریص ہین وہ اپنے نفس پر قابو نہ پا سکے اور یہ سمجھ کر کہ اب روزہ رکھنا بے سُود ہے، روزہ چھوڑ دیا کرتے تھے ایسی صورت مین ان کو بتا دینا ضروری تھا کہ رات مین عورتون سے مباشرت بجز اس صورت کے کہ ایک شخص اعتکاف مین ہو جائز ہے، دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی روزے تین ہی دن کے تھے تو اس قدر کم تھے کہ اس قسم کی کوئی حجت پیدا نہ ہو سکتی تھی اس لیے یہ بھی قرین قیاس نہین کہ روزے واقعی تین دن کے تھے۔ یہ اعتراض وزنی ہے اور مین اس اعتراض کو تسلیم کرتا ہون میری ذاتی راے ہے اور اس کو مد نظر رکھ کر مین حدیث کا مطالعہ کرون گا کہ درحقیقت رمضان کے روزے آخری دس دن کے روزے ہین اور اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے میرے دلائل یہ ہین۔

۱۔ عام طور سے اعتکاف رمضان کے آخری عشرے مین کیا جاتا ہے اور یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ اعتکاف اور روزے ساتھ ساتھ ہوتے تھے یعنی جس طرح حج و عمرہ دو چیزون سے مل کر حج پورا ہوتا ہے اور اسمین اختیار ہے کہ خواہ حج کرے یا عمرہ اور اس کے بھی دس ہی روز ہین اسی طرح رمضان مین اعتکاف اور روزہ ساتھ ساتھ تو دس روز ہوتے تھے، روزے کے ساتھ اعتکاف کرے تو اچھا ہے اور اگر اعتکاف نہ کرے بلکہ صرف روزہ رکھے تو بھی حرج نہین، البتہ جب اعتکاف کرے تو رات کو عورتون سے مباشرت منع ہے، چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

ولا تباشروھن وانتم عاکفون فی المسجد۔

۲۔ یہودیون مین قاعدہ تھا کہ وہ روزہ جس دن کی یاد مین رکھتے تھے، وہ ان کی عید کا دن ہوتا تھا، اور اس کی خوشی منانے کے لیے اس سے تین چار روز قبل سے روزے رکھتے تھے تاکہ عید کے روز کھانے پینے مین زیادہ خوشی حاصل ہو، اس قدر تسلیم ہے کہ قرآن کے نزول کی یادگار مین روزہ رکھنے کا حکم مسلمانونکو دیا گیا ہے اور حق تو یہ ہے کہ یہ دن اسلام کی اتنی عظیم الشان یادگار ہے جس کے مقابلے مین ولادت رسول، معراج، فتح بدر وغیرہ سب ہیچ ہین اور اس یادگار کو قائم رکھنا یقینًا ایسی صورت مین بہتر ہو سکتا جب کہ اس کے سامنے کوئی ایسا عمل مسلمان اختیار کرتے جیسا روزہ ہے، پھر چونکہ اس قدر مسلم ہے کہ لیلۃ القدر جسمین قرآن نازل ہونا شروع ہوا، رمضان کے اخیر عشرہ مین ہے، اس لیے بہتر یہی تھا کہ ۲۱ رمضان سے روزہ شروع کیا جاے، اس مین نزول قرآن کی یاد تازہ کرنے کا زیادہ موقع تھا، اور لیلۃ القدر کی اختلافی تاریخون پر بھی حاوی ہے۔

۳۔ مسلمانون مین چار فرائض ہین ۲ روزانہ اور ۲ سالانہ یعنی صلوٰۃ و زکوٰۃ روزانہ اور روزہ و حج سالانہ سالانہ فرائض کے اختتام پر عید منائی جاتی ہے۔ حج مین سالانہ فرائض کے لیے نو یا دس دن مقرر ہین جو ذی الحجہ کی پہلی تاریخ سے شروع ہوتے ہین، اسی طرح رمضان کے روزے اور اعتکاف کے دس دن ہین اور ان کے بعد عید منائیجاتی ہے دونون کی مماثلت عید سے نہین بلکہ دنون سے بھی ہے۔

۴۔ ایام معدودات کا اشارہ ثابت کر رہا ہے کہ روزے دس سے زیادہ ہو نہین سکتے اور اسلیے درحقیقت روزے جو مسلمانون پر قرآن کے روسے فرض معلوم ہوتے ہین وہ ۲۱ ر رمضان سے ۲۹ ر رمضان یا صبح عید تک ہین جس مین بعض اعتکاف کرتے ہین اور بعض صرف روزے پر اکتفا کرتے ہین۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ آیا حدیث سے تیس دن کے روزے ثابت ہین۔ سو قبل اس کے کہ حدیث کا مطالعہ شروع کرون مجھے ایک بار پھر مسلمانون کو تاریخ پر توجہ دلانی ہے اگر تم انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا مین Fasting یعنی روزے کا مضمون پڑھو تو تم کو معلوم ہوگا کہ عیسائیون مین ایام صیام پر بعد کو عجب اختلافات پیدا ہوے، بعضون نے ہفتے مین جمعے اور سنیچر کو روزہ رکھنا فرض جانا، بعضون نے سال مین تین دن یعنی ایسٹر کے دنون مین جب مسیح نے صلیب پائی تھی اور جب وہ زندہ ہوے تھے یعنی جمعے سے لے کر اتوار تک لیکن عیسائیت جب رہبانیت کی طرف بہت شدت سے مائل ہوئی تو اس کے ساتھ ہی روزے کے لیے چالیس ۴۰ روز بہ تقلید حضرت مسیح مقرر ہو گئے، عربونکو سب سے پہلے یہ روزے دار رہبانیین شام و فلسطین مین ملے، انھون نے دیکھا کہ قرآن کے روزے ان کے روزون کے آگے کوئی حقیقت نہین رکھتے اور یہ لوگ فخر کرتے تھے کہ ان مین خدا پرستی مسلمانون سے زیادہ ہے اس لیے عربون کو یقیناً تیس دن کے روزے رکھنے کا خیال ہر دم رہا ہو گا۔

اب آیئے حدیثون پر غور کرین۔ حدیث مین سب سے زیادہ جو چیز مجھے حیرت مین ڈالنے والی ہے وہ ثواب کی کمی و زیادتی کا بیان ہے کہ مثلاً ایک شخص اپنے گھر مین نماز پڑھے تو اس کو ایک من کا ثواب ملیگا، مسجد مین پڑھے تو پچاس من، بیت المقدس مین پڑھے تو ہزار من، اور مکے مین پڑھے تو لاکھ من ثواب، معلوم نہین اس تعداد مین کیا راز تھا، کیا مسلمان بغیر اس لالچ کے نیک کام کرنے کے اہل نہین تھے، لہٰذا مین ان حدیثون کو تو قطعی چھوڑ دون گا جو روزے کی ترغیب مین پائی جاتی ہین، اگر کسی کو ان کا شوق ہو تو احیاء العلوم مین امام غزالی کی روایتون کو پڑھے جس مین خدا کے فضل سے تمام صحیح و ضعیف حدیثین ہماری آسانی کے لیے جمع کر دی گئی ہین، مجھے صرف ان حدیثون پر غور کرنا ہے جن مین ایام صیام کی تعیین کی گئی ہے اور ان مین بھی وہ جو رسول اللہ صلعم کی طرف سے حکم کی صورت مین ہون، کیونکہ نماز کی طرح رسول اللہ صلعم نوافل روزے بھی بکثرت رکھتے تھے جو عامۃ المسلمین پر شاق ہین اور اسکی تقلید ہر شخص سے ہو ہی نہین سکتی کیونکہ ہر شخص نبی نہین ہو سکتا، اور اس سے روزے کے دنون کا وجوب نکالنا صحیح نہ ہو گا

اس کے بعد میرا دعویٰ ہے کہ حدیث میں تیس دن کے روزے کا کوئی حکم صریح میری نظر سے نہیں گذرا، میں مسلم و ابن ماجہ کے باب صیام کی تمام متفرق احادیث یہاں جمع کیے دیتا ہوں قارئین خود نتیجہ نکال لیں۔ البتہ ابوہریرہ کی وہ حدیث جو ابن ماجہ میں ہے رمضان کے تیس روزے پر دلالت کرتی ہے مگر اس حدیث سے کوئی حکم مستنبط نہیں ہوتا صرف اس سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ نفلاً تمام ماہ رمضان روزہ رکھتے تھے، وہ حدیث یہ ہے

ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ۲۹ دن کے روزے رکھے اور زیادہ سے زیادہ تیس دن

ایک حدیث اور ابوہریرہ کی ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم چاند دیکھو تو روزہ رکھو اور جب پھر چاند دیکھو تو افطار کرو پھر اگر ابر آجائے تم پر تو تیس روزے پورے کرو۔

معلوم ہوتا ہے کہ راوی نے یقیناً آخر کا جملہ بڑھا دیا ہے کیونکہ ابن عمر کی حدیث میں جو بالکل اسی طرح کی ہے یہ الفاظ نہیں ہیں۔ پہلی کے معنی صاف ہیں یعنی مہینے کے آخر ہفتے میں چاندنی رات رات کے آخر حصے میں شروع ہوتی ہے پس رات کے آخری حصے سے روزہ شروع کرکے رات کو جب تک آسمان پر ستارہ نکل آئیں روزہ رکھو، دوسرے چاند سے غلط فہمی ہوجاتی ہے گر حدیث میں ایسی لفظی غلطیاں بے انتہا ہیں، مثال کے لیے جابر کی وہ دو حدیثیں دیکھو جو غزوہ بطن بواط کے واقعات کو بیان کرتی ہیں اور ایک دوسرے کی کس قدر ضد ہیں اور دونوں نے کس قدر وہیل مچھلی کی ماہیت کے بارے میں مبالغے سے کام لیا ہے جس کی تردید ہر زمانے میں وہیل مچھلی کو دیکھ کر ہوسکتی ہے، دونوں حدیثیں مسلم میں موجود ہیں، طویل حدیث کو چھوڑے دیتا ہوں جسکا جی چاہے وہ مسلم میں دیکھ لے۔ مختصر حدیث کا یہاں ترجمہ کیے دیتا ہوں۔ یہ بھی واضح رہے کہ جنگ بطن بواط کا یہ قصہ واقدی نے جو مسلم سے پہلے کی کتاب ہے اور یقیناً اس سے زیادہ مستند ہے بیان نہیں کیا۔

رسول اللہ صلعم نے ہم کو بھیجا اور ہمارا سردار ابوعبیدہ بن الجراح کو کیا تاکہ ہم ملیں قریش کے قافلے سے اور ہمارے توشے کے لیے ایک تھیلا کھجور کا دیا اور کچھ آپ کو نہ ملا، تو ابوعبیدہ ہم کو ہر روز ایک کھجور دیا کرتے تھے ابوالزبیر نے کہا میں نے جابر سے پوچھا تم ایک کھجور میں کیا کرتے تھے؛ انھوں نے کہا اس کو چوس لیتے تھے بچے کی طرح پھر اس پر تھوڑا پانی پی لیتے تھے وہ ہم کو سارے دن رات کو کافی ہوجاتی اور ہم اپنی لکڑیوں سے پتے جھاڑتے پھر اس کو پانی میں تر کرتے اور کھاتے۔ جابر نے کہا ہم گئے سمندر کے کنارے تک وہاں ایک ٹیلی سی چیز نمودار ہوئی۔ ہم اس کے پاس گئے دیکھا تو وہ ایک جانور ہے جس کو عنبر کہتے ہیں۔ ابوعبیدہ نے کہا یہ مردار ہے پھر کہنے لگے نہیں ہم اللہ کے رسول کے بھیجے ہوے ہیں اور اللہ کی راہ میں نکلے ہیں اور تم بے قرار ہو رہے ہو تو اس کو کھالو، جابر نے کہا ہم وہاں ایک مہینے رہے اور ہم تین سو آدمی تھے اسکا گوشت کھایا کیے یہاں تک کہ ہم موٹے ہوگئے

جابر نے کہا تم دیکھو ہم اس کی آنکھ کے حلقے مین سے چربی کے گھڑے کے گھڑے بھرتے تھے آخر ابو عبیدہ نے ہم مین سے تیرہ آدمیون کو لیا وہ سب اس کی آنکھ کے حلقے کے اندر بیٹھ گئے اور ایک پسلی اس کی پسلیون مین سے اُٹھا کر کھڑی کی پھر سب سے بڑے اونٹ پر پالان باندھا اور وہ اس کے تلے سے نکل گیا اور ہم نے اسکے گوشت کو اُبال کر توشے کے لیے جمع کیا جب ہم مدینے آئے تو رسول اللہ صلعم کے پاس آئے اور یہ قصہ بیان کیا، آپ نے فرمایا وہ اللہ تعالےٰ کا رزق تھا جو تمھارے لیے اس نے نکالا تھا، اب تمھارے پاس کچھ ہے اس کا گوشت تو ہمکو بھی کھلاؤ جابر نے کہا ہم نے اس کا گوشت آپ کے پاس بھیجا، آپ نے اس کو کھایا۔

اس حدیث کے بعد وہ لمبی حدیث پڑھو جو عبادہ بن الولید نے جابر سے روایت کی ہے اور جس مین رسول اللہ صلعم کے کئی معجزات کا بھی ذکر ہے اور آخر مین اس جانور کے نکلنے کا، دونون واقعات ایک ہی مین ہین، اگر دونون مین بے انتہا اختلاف ہی ایسا اختلاف کہ ایک روایت قطعی اور راز سرتا پا جھوٹ ثابت ہو جاتی ہے۔ اور دونون روایتین خود اس طرح جھوٹ ہین کہ وھیل کی آنکھ نہ اتنی بڑی ہوتی ہے کہ اس مین تیرہ ۱۳ آدمی سما جائین اور نہ اسکی پسلی اتنی بلند ہوتی ہے کہ اونٹ اس کے نیچے سے نکل جائے۔

اسلیے اگر حدیث مین جا بجا ایسی روایتین رمضان کے تیس روزون کے باب مین نظر آ رہین تو انسے گھبرانا نہ چاہیے کیونکہ ادنیٰ غور و تامل سے ان کی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔

مین نے جو حدیث بیان کی ہے وہ ابو ہریرہ کی ہے اور ابن ماجہ و مسلم مین پائی جاتی ہے اسکا موازنہ اِس حدیث سے کر لو تم کو فوراً اندازہ ہو جائے گا کہ ابو ہریرہ کی حدیثون کی کیا وقعت ہے۔

۱۔ ابو ہریرہ سے روایت ہے قسم ہے کعبہ کے رب کی یہ بات کہ جو کوئی صبح کرے جنابت کی حالت مین وہ افطار کرے، مین نے نہین کہی بلکہ محمد صلے اللہ علیہ وسلم نے کہی (ابن ماجہ)

باوجودیکہ ابو ہریرہ جانۂ کعبہ کی حلف لے رہے ہین مگر یہ حدیث بالکل مردود ہے۔ عائشہ و ام سلمہ ہی سے اس کی تردید نہین ہوتی بلکہ حنفیہ، شافعیہ و مالکیہ سب متفق ہین کہ یہ قول صحیح نہین۔

۲۔ رسول اللہ صلعم ہر سال مین اخیر رمضان کے دس دن مین اعتکاف کیا کرتے تھے (بخاری)

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا دنیا کے کسی دن مین عبادت کرنا اللہ تعالیٰ کو اتنا پسند نہین جتنا ان دس دنون مین، اور ایک دن کا روزہ سال بھر کے روزون کے برابر ہے، اور ایک رات عبادت کرنا شب قدر کے برابر ہے (ابن ماجہ)

۴۔ آن حضرت صلے اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخر دس دن مین اعتکاف کرتے نافع نے کہا عبداللہ ابن عمر نے مجھے وہ جگہ تبلائی جہان آن حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اعتکاف کیا کرتے تھے۔ (مسلم انس عمر)

۵۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان شریف کے آخر دس دن مین ایسی کوشش کرتے تھے عبادت مین کہ ویسی اور دنون مین نہین کرتے تھے (مسلم، عائشہ)

۶۔ دوسری روایت مین ہے جب رمضان کا آخر عشرہ آتا تو رات کو جاگتے اور ازار کو مضبوط باندھتے (یعنی عورتون سے ہم بستر نہ ہوتے)

۷۔ حضرت عائشہ صدیقہ سے پوچھا گیا رسول اللہ صلعم کے روزون کے بارے مین، انھون نے کہا آپ شعبان کے سارے مہینے کے روزے رکھتے تھے یہان تک کہ اس کو ملا دیتے تھے رمضان سے (ابن ماجہ عائشہ)

۸۔ میرے اوپر رمضان کے روزون کی قضا ہوتی تھی تو مین اس کو نہ کرتی یہان تک کہ دوسرے سال کا شعبان آجاتا، عائشہ (ابن ماجہ)

۹۔ جابر کی روایت ہے کہ مین نے انحضرت صلعم کو دیکھا کہ آپ روزے سے جمعہ کے دن نہوتے

نمبر ۷، ۹ کی حدیثون پر غور کرو اس کے بالکل مخالف روایت ابوہریرہ کی ہے جب ایسی ظاہر باتون مین حدیث کا یہ اختلاف ہو تو سوائے قرآن کے اور کہان قابل اطمینان بات میسر ہوسکتی ہے۔ بہرحال میرا ایمان ہے کہ قرآن مین ایام صیام کی کافی وضاحت ایاما معدودات مین موجود ہے، اور کوئی قول قرآن کے اس حکم کو منسوخ نہین کرسکتا، حدیث سے اس قدر تائید ہوتی ہے کہ آپ نے رمضان کے آخری عشرہ مین خصوصیت سے روزے کا اہتمام کیا ہے، چونکہ آخری عشرہ مین نزول قرآن کی ایک تاریخ بھی ہے اور آخری عشرہ پر ایام معدودات کا محل بھی ہوسکتا ہے اس لیے رمضان کے روزے اتنے ہی فرض ہین

قرآن سے ایام صیام کے دو اور نکتے

تم نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ قرآن مجید نے روزہ کا حکم دیتے ہوئے یہ کیون کہا کما کتب علی الذین من قبلکم یہ قطعی ثابت ہے کہ یہودیون مین کم سے کم ایک دن اور زیادہ سے زیادہ تین دن کے روزے سالانہ تھے لہذا قرآن کا قول صحیح نہین (نعوذ باللہ) کہ تم پر یہودیون کی طرح روزے فرض کیے گئے، اگر اس سے زیادہ لطیف نکتہ ایام معدودات کے روزون کا یہ ہے کہ روزہ قرآن کے نازل ہونے کی یاد مین رکھا جاتا ہے کبھی تم نے اس پر غور کیا کہ قرآن کے نازل ہونے مین وہ کیا خصوصیت تھی کہ اس کی یادگار روزہ رکھنے سے منائی جائے۔ بات یہ ہے کہ قرآن ایک عہدنامہ ہے خدا اور اس کے بندون مین یعنی عہد خداوندی یہ ہے کہ اگر تم ایمان لاؤگے اور نیک عمل کروگے تو ہم تم کو دنیا مین بھی ممتاز رکھین گے اور آخرت مین بھی، یہی عہد خدا کا یہود و نصاریٰ سے تھا، چنانچہ اب تک یہود و نصاریٰ اپنی الہامی کتابون کو عہد نامۂ جدید و عہد نامۂ قدیم کہتے ہین۔ ہم اس عہد سے کس قدر عہدہ برآ ہوئے ہین۔ خدا کو خوب معلوم ہے اس نے خود کہہ دیا کہ انسان نے ایسے گران قدر عہد کو اٹھالیا ہے کہ پہاڑ بھی ہوتا تو متحمل نہ ہوتا، یقیناً انسان جاہل اور کمزور ہی

اس سے عہد ٹوٹے گا اور ٹوٹے گا اور اللہ تعالیٰ کی یہ رحمت ہے کہ اس عہد کو بار بار توڑنے کی وجہ سے ہم پر عذاب نہین کرتا بلکہ اپنی نہایت مہربانی سے روزہ رکھا کر ہمارے اس عہد کے توڑنے کا کفارہ ہر سال دلواتا ہے اور اور قرآن مین عہد توڑنے کا کفارہ کیا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

لا یواخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم ولکن یواخذکم بما عقدتم الایمان فکفارتہ اطعام عشرۃ مساکین من اوسط ما تطعمون اھلیکم او کسوتھم او تحریر رقبۃ فمن لم یجد فصیام ثلثۃ ایام ذلک کفارۃ ایمانکم اذا حلفتم واحفظوا ایمانکم کذلک یبین اللہ لکم ایٰتہ لعلکم تشکرون۔ (سورۂ مائدہ آیت ۸۹)

حق گو

کاجل، سرمہ، چورن، منجن

ایڈیٹر صاحب نگار نے خود ان دواؤن کا اطمینان کر کے اپنی راے ان کے مفید ہونے پر اکتوبر کے ملاحظات مین ظاہر کی ہے دوسری تازہ سند ملاحظہ ہو:- سرمہ ضعف بصارت کے لیے بہت مفید ہوا، ایک شیشی اور بھیج دیجیے،

سید رضا زبرسو پنتھ پوت محل

کاجل، آشوب، سُرخی، ضعف بصارت کیلیے ازبس مفید ہے، ایک ڈبیہ جو ایک شخص کیلیے سال بھر کو کافی ہے۔ قیمت ۴ر

سرمہ، یہ بیش بہا سرمہ چالیس دن مین تیار ہوتا ہے اس مین نہ میرہ نہ کوئی جواہر بلکہ معمولی سرمہ ہے جسکو جڑی بوٹیون کے عرق مین پیس کر تیار کیا جاتا ہے اس کے فوائد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جالا، دھند، موتیا بند اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے اور بار بار آزمایا ہوا ہے قیمت فی ڈبیہ عہ علاوہ محصول

چورن، یہ وہ اکسیری چیز ہے جسکا ہر گھر مین رہنا ضروری ہے، پیٹ کا درد، قبض، نفخ، ریاح کا پیدا ہونا، سوء ہضم، دستون کا آنا سب یک لخت اسکے استعمال سے جاتا رہتا ہے، کیسا ہی شدید درد پیٹ مین ہو ایک چٹکی کھالینے سے جاتا رہتا ہے۔ قیمت فی ڈبہ ۵ تولہ عہ علاوہ محصول

منجن، اس کی ادنیٰ خوبی یہ ہے کہ ہلتے ہوے دانت جم جاتے ہین۔ قیمت فی ڈبہ ۵ تولہ عہ علاوہ محصول وغیرہ

نوٹ:- سب چیزین منگوانے والون کو محصول ڈاک معاف۔

م بیگم ذریعہ دفتر نگار لکھنؤ

ٹیلی فون نمبر ۶۷

مسٹر زیدی جب ولایت سے واپس آئے تو اور نشے تو خیر جلد ہرن ہوگئے لیکن یہ یقین ان کے دل سے کسی طرح محو نہ ہوا کہ بیوی نام ہے صرف اس عورت کا جو جلسے مین تقریر کر سکے، ادبیات پر تنقید کی اہلیت رکھتی ہو نظم و نثر مین مصنفانہ حیثیت کی مالک ہو، رقص کرنے والیون کی جماعت مین بہترین بنڈلی پر انعام حاصل کر سکتی ہو اور اگر کبھی ضرورت ہو تو گرلس اسکول کی معلمہ بھی بن سکے اور ماسٹر ٹیلر بھی یعنی اس سلسلہ مین خیر سے یہی ایک بات ایسی تھی جو ان کی اہلی و معاشرتی زندگی کے لیے مفید ہو سکتی تھی۔

کامل ایک سال تک انھون نے مختلف رسالون اور اخبارون مین اشتہار دیا، احباب واعزہ کے ذریعے سے جستجو کی مختلف شہرون کی مختلف آزاد سوسائٹیون مین خود جا کر اس جنس نایاب کو تلاش کیا۔ جب کہین جا کر مس لطیفہ سہروردی ان کے ہاتھ آئین۔

مس سہروردی بمبئی کے اس خاندان کی جوہر تابندہ تھین جو بہت عرصہ ہوا بہ سلسلۂ تجارت ایران سے ترک سکونت کر کے بمبئی آگیا تھا اور مغربی تہذیب و معاشرت کے حصول مین جس کی شہرت تقریباً ایک صدی سے قائم تھی مسٹر اشفاق حسین سہروردی مس سہروردی کے والد ہر چند مالی حیثیت سے کوئی ممتاز درجہ نہ رکھتے تھے لیکن مغربی تہذیب مین ان کی واقفیت و مہارت اس قدر مشہور تھی کہ کوئی بلند سوسائٹی ایسی نہ تھی جہان انکی رسائی نہ ہو اور شاید ہی کوئی تقریب تہذیب جدید کی ایسی ہوتی ہو جس مین ان سے مشورہ نہ طلب کیا جاتا ہو — گورنر کا ڈنر ہو یا کسی آنریبل ممبر کا، کوئی الوداعی جلسہ ہو یا خیر مقدم کا اس کا اہتمام انھین کے سپرد ہوتا تھا اور اس مین کلام نہین کہ جس وقت وہ اپنی صاحبزادی مس سہروردی کے ساتھ محفل کے سلیقے و ترتیب مین مصروف ہو جاتے تو خدا جانے کیون ہر جگہ اور ہر چیز مین آپ ہی آپ ایک خاص قسم کا حسن نظر آنے لگتا۔

مسٹر سہروردی کے متعدد لڑکیان ہوئین لیکن سب کی سب جوان ہونے سے پہلے ہی مر گئین، صرف ایک صاحبزادی مس لطیفہ زندہ رہین، اور یہ کہنا غالباً خلاف حقیقت نہ ہوگا کہ شاید ان کی تمام مرنے والی بہنین اپنے مستقبل کا حسن و شباب انھین کے سپرد کر گئی تھین

مس لطیفہ کی تعلیم تو صرف ایف۔ اے تک ہوئی تھی لیکن چونکہ ہوئی تھی وہ بالکل مغربی ماحول مین اور اس کے بعد کافی زمانہ انھون نے یورپ مین بھی بسر کیا تھا اس لیے ان کا شماران برقہارون مین سے تھا جو یورپ مین بھی ہمیشہ حلقۂ امراء ہی کے اندر گردش کرتے نظر آتے ہین اور مشرق مین بھی اندور، رامپور اور کشمیر سے کم کسی جگہ کو اپنی سیر کا جولانگاہ نہین بناتے۔

یورپ مین مس سہروردی کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ جس نے تقریباً بین الاقوامی قسم کا حسن ان مین پیدا کر دیا تھا، ان کی اسٹیج کی زندگی سے متعلق تھا۔ جب وہ صرف شوق کی بنا پر بغیر حصول اُجرت آرکسٹرا مین اپنے غیر معمولی جمال اور اپنی سحر آفرین موسیقی کا مظاہرہ کیا کرتی تھین مشہور تھا کہ ان کے جوتے کی نوک اسی طرح سبک و سریع جنبش کے ساتھ تختۂ رقص کو چھوتی تھی جیسے ہرن کے پاؤن چوکڑی بھرنے کے وقت۔ اور جب برلیقہ کی رنگین روشنیان ان کے قامت خوش اندام پر ڈالی جاتین تو ایسا معلوم ہوتا کہ یا تو وہ پرستان کی کوئی مخلوق ہے جو راستہ بھول کر دنیا مین آگئی ہے یا سمندر کی کوئی دیوی جو دنیا والون کو ڈبو دینے کے لیے سطح آب پر آگئی ہے۔ اس کے بعد مس سہروردی کی شہرت کا دوسرا دور وہ تھا جب امپیریل فلم کمپنی نے انھین تصویر متحرک بننے کی دعوت دی اور یہ واقعہ ہے کہ اگر انکی وجہ سے دو نوجوانون مین باہم جنگ کی نوبت نہ آجاتی اور اس بدنامی کی بنا پر وہ ہندوستان کی واپسی پر مجبور نہ ہوتین تو ان کے اسٹار بننے مین چند ہفتون سے زیادہ کی دیر نہ تھی ـــــ وہ کلبون اور جلسون مین بھی شریک ہوتین تقریرین کرتین اور اپنی خطابت کی داد ہر شخص سے حاصل کرتین۔ ادبیات کے متعلق غالباً اس قدر کہہ دینا کافی ہوگا کہ یورپ کے مشہور رسائل مین ان کی نظمین اکثر شایع ہوتی تھین اور افسانہ نویسی مین بھی ان کی ذہانت کافی شہرت حاصل کر چکی تھی۔

مسٹر زیدی کو یہ دولت بے پایان کس طرح ہاتھ آئی یہ ایک ایسا سوال ہے کہ بعض اوقات خود جناب زیدی کی بھی سمجھ مین نہ آتا اور ان کو اپنی خوش بختی پر خواب کا سا دھوکا ہونے لگتا۔ مسٹر زیدی سویلین افیسر تھے ایک ہزار سے زاید کا مشاہرہ پاتے تھے، شہر کی تمام بلند سوسائٹیون مین عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے یہ سب سہی لیکن مس لطیفہ جو اپنے اکتسابات و خصوصیات کے لحاظ سے کسی شاہانہ ہاتھ کی بجا طور پر متمنی ہو سکتی تھین کس طرح ان سے مالوف ہوگئین۔ مسٹر زیدی تنہائی مین تو اس کو صرف خدا کی دین سمجھتے تھے، لیکن احباب مین بیٹھ کر اسے وہ اپنے تصرفات حسن و تہذیب سے تعبیر کرتے تھے، کیونکہ واقعی وہ حسین بھی تھے اور صد درجہ شائستہ و خوش اطوار بھی۔

مسٹر قاسم بھائی کی تقریب شادی مین جب اول اول ان دونون کا تعارف ہوا تو ان مین سے کسی کو یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ایک وقت وہ آئے گا جب یہ رشتۂ ازدواج سے منسلک ہو جائین گے ـــــ

مسٹر زیدی کا بیان ہے کہ سب سے پہلا واقعہ جسے ان کے قلب نے متاثر کیا مس لطیفہ کی وہ تقریر تھی جو انھون نے عقدِ ثریا کلب کے عام مجمع مین عورت کے مستقبل پر کی تھی اور مس لطیفہ کا کہنا یہ ہے کہ ان پر سب سے زیادہ اثر جس بات نے کیا یہ تھی کہ جب مسٹر زیدی فینسی ڈرس ہال مین بہترین وضع و آرایش کی پارسی خاتون بنکر آئے تو وہ خود بھی نہ سمجھ سکی کہ واقعی یہ کوئی عورت نہین ہے بہر حال سبب یہ ہو یا کوئی اور اس مین شک نہین کہ ہوا سب کچھ بہت اچانک اور اس قدر جلد کہ تمام شہر حیرت زدہ سا ہو گیا۔

عروسِ نو کا حجاب، نئی جگہ جانے کی جھجک، اجنبیون مین دفعۃً پہنچ جانے کی شرم، ہفتون تک گھونگھٹ نہ کھولنا اور سمٹے سمٹائے بیٹھے رہنا ——— ان باتون کا وہان کیا ذکر تھا اگر کوئی تغیر لطیفہ سہروردی کی زندگی مین ہوا تو صرف اتنا کہ وہ ایک مکان سے اُٹھ کر دوسرے مکان مین آگئین۔ مسٹر زیدی سے ظاہری بے تکلفی پہلے ہی سے تھی اب اخلاقی و معاشرتی یگانگت بھی پیدا ہو گئی اور جب ایک ماہ کے بعد دونون بنگلور سے ہنی مون کا زمانہ بسر کرکے پونا مین آئے جو مسٹر زیدی کا مستقر تھا تو دونون ایسا محسوس کر رہے تھے کہ شاید دونون کی ملاقات برسون کی ہے، اور جذبات مین کوئی گرمی باقی نہین رہی۔

لطیفہ سہروردی لاکھ ذہین و طباع سہی مگر اس مین شک نہین کہ اس نے مسٹر زیدی کے بعض خصوصیات سمجھنے مین غلطی ضرور کی۔ یا یہ کہ خود اس نے اپنی قوتِ اقتدار کا اندازہ صحیح نہین کیا، یقیناً وہ حسن و جمال کے لحاظ سے ایک بدیعۂ قدرت تھی اس مین کلام نہین کہ تہذیب و تعلیم کی حیثیت سے وہ بہترین نتیجۂ تربیت تھی اور ظاہر ہے کہ اس پر مٹنے اور مٹتے رہنے کے لیے اس سے زیادہ زبردست دلیل ایک مرد کے پاس اور کیا ہو سکتی تھی لیکن وہ شاید اس سے واقف نہ تھی کہ انسان نہ حسن و جمال کے لیے بے تاب ہوتا ہے نہ آرایش ملبوس و زیبایش گیسو پر مٹتا ہے بلکہ وہ تڑپتا ہے صرف اس لیے کہ فلان چیز اس کی نہین ——— اور جس قدر زیادہ یقین کسی شے کے بعید یا عسیر الحصول ہونے کا ہوتا جاتا ہے اسی قدر اس کی بیتابیان بڑھتی جاتی ہین اس لیے مشکل ہی سے چار ماہ کا زمانہ گذرا ہو گا۔ کہ مس سہروردی نے اپنی ازدواجی زندگی کی بے نمکی کو محسوس کرنا شروع کیا اور ایک ہلکے قسم کا استغنار دونون مین پیدا ہو گیا۔ لیکن چونکہ مسٹر زیدی اس قسم کے صاحبون مین سے تھے جن کو ہر وقت یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ وہ اپنے ہندی الاصل ہونے کا داغ کیونکر مٹائین، دوسری طرف لطیفہ سہروردی ان عورتون مین سے تھین جنھین اگر شادی سے قبل مس صاحب اور شادی کے بعد میم صاحب نہ کہا جائے تو برہم ہو جاتی ہین، اسلیے اگر اُدھر زیدی صاحب ایک بہترین صاحب بننے کی ایکٹنگ کر رہے تھے تو دوسری طرف لطیفہ سہروردی بھی لوگون کی نگاہون مین اپنے آپ کو بالکل معیاری میم صاحب ظاہر کرنا چاہتی تھین، بنگلے کے اندر تنہائی مین خواہ ایک کو دوسرے سے

گفتگو واختلاط کی نوبت ہفتوں نہ میسر ہو لیکن کھانے کی میز پر خادموں کو دکھانے کے لیے ڈرائنگ روم میں ملاقاتیوں کو دھوکا دینے کے لیے اور موٹر پر شوفر کو جلانے کے لیے باہم لطف محبت کا اظہار ضروری تھا

ان دونوں کی روزانہ زندگی کا پروگرام یہ تھا۔

مسٹر زیدی۔ صبح آٹھ بجے حاضری کے بعد ملاقات کے کمرے میں آجانا، گیارہ بجے کچہری جانا ۴ بجے شام کو واپس آکر چائے پینا اور ٹینس کھیلنے کے لیے فوراً چلا جانا، رات کو ۹ بجے واپس آکر کھانا کھانا، اور خواب گاہ میں چلا جانا۔

لطیفہ سہروردی۔ صبح کی حاضری سے فارغ ہو کر سیر وملاقات کے لیے نکل جانا اور ایک بجے واپس آکر چار بجے تک خطوط وغیرہ لکھنا، شام کو مسٹر زیدی کی واپسی سے قبل تنہا چائے پی کر عقد تھیٹر یا کلب میں جاکر رات کو واپس آنا اور اگر کبھی کوئی محفل رقص وسرود برپا ہوگئی تو صبح کر دینا

مختصراً یوں سمجھ لیجیے کہ ان دونوں کی زندگی اس طرح بسر ہوتی تھی کہ جب میاں گھر میں ہوتے تو بیوی گھر سے باہر ہوتیں، اور جب بیوی گھر میں ہوتیں تو میاں موجود نہ ہوتے گویا یہ دونوں قطب نما سوئی کے دو سرے تھے کہ اگر ایک سرا شمال کو ہوگا تو دوسرے کا جنوب کی طرف رہنا لازم ہے۔

مہینوں گذر گئے اور ان دونوں کی زندگی جو بالکل مشین کی طرح تھی بغیر کسی شکوہ وشکایت کے جاری رہی ایک روز شام کو جب مسٹر زیدی کچہری سے واپس آئے تو انھیں یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ بیوی گھر ہی میں ہیں اور اب تک باہر نہیں گئیں دریافت سے معلوم ہوا کہ کوئی خاتون مہمان آئی ہوئی ہیں، یہ سیدھے اس کمرے کی طرف پہنچے اور دروازے پر دستک دے کر اندر آنے کی اجازت طلب کی تھوڑی دیر میں لطیفہ سہروردی نے اٹھ کر خود دروازہ کھولا، اور جب مسٹر زیدی اندر پہنچے تو "مس بلقیس" سے تعارف کرایا گیا جو کراچی سے تشریف لائی تھیں۔

بلقیس کراچی کے ایک مشہور تاجر کی صاحب زادی تھیں اور مس سہروردی کے ساتھ ہی تعلیم پاتی تھیں اتفاق سے جب وہ بمبئی آئیں اور انھیں مس سہروردی کی شادی کا حال معلوم ہوا تو ملنے چلی آئیں۔

رسم تعارف ادا ہوگئی، تھوڑی دیر تک پورے لطف کے ساتھ آپس میں گفتگو ہوتی رہی اور جس وقت مسٹر زیدی وہاں سے اُٹھ کر واپس آئے تو اُن کے دماغ میں لطیفہ سہروردی اور بلقیس دونوں کی صورتیں قائم تھیں لیکن اس طرح کہ ایک میں ان کو بہت سے نقائص نظر آرہے تھے اور دوسری میں سیکڑوں محاسن

یہ بالکل واقعہ ہے کہ شکل وصورت کے لحاظ سے لطیفہ سہروردی کو بلقیس پر کسی طرح ترجیح نہیں دی جاسکتی تھی لیکن اطوار کے لحاظ سے وہ بلقیس سے بدرجہا بلند تھی مگر اس کا کیا علاج کہ لطیفہ سہروردی مسٹر زیدی کی بیوی تھیں اور بلقیس ان کی کیا کسی کی بھی بیوی ابھی تک نہیں بنی تھی۔

جب تک مسٹر زیدی کچہری سے واپس نہ آئے تھے وہ لطیفہ سہروردی کے یہاں قیام کرنے سے انکار کر رہی تھی لیکن جب اس نے ایک بار زیدی اور اس کی نگاہوں کو دیکھ لیا تو خود ہی قیام پر راضی ہوگئی اور چار دن کے اندر وہ زیدی سے اس قدر بے تکلف ہوگئی گویا برسوں کی ملاقات تھی اول اول تو لطیفہ کو یہ خیال ہوا کہ جب زیدی گھر میں ہوتی ہیں تو بلقیس کیوں کوئی نہ کوئی بہانہ کرکے اس کے ساتھ باہر جانے سے انکار کر دیتی ہے اور جب زیدی کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ بلقیس باہر جانے والی نہیں تو کیوں وہ شام کا ٹینس اور کلب غائب کر دیتے ہیں لیکن آخر کار ایک دن یہ راز کھل کر رہا اور زندگی میں سب سے پہلی مرتبہ لطیفہ سہروردی میں وہ تمام نسائی جذبات رشک رونما ہوئے جو ایکبار ابھر آنیکے بعد مشکل ہی سے بغیر انتقام کے آسودہ ہوسکتے ہیں۔

ایک دن شام کو جب وہ کلب سے بالکل غیر متوقع طور پر گھر واپس آئی اور بالائی منزل کا دریچہ کھول کر نماز باغ میں نگاہ ڈالی تو اس نے بعید ترین گوشے میں ایک بنچ پر ان دونوں کو اس طرح مصروف اختلاط دیکھا کہ مشکل سے وہ اپنی نگاہوں پر اعتبار کرسکتی تھی۔ بلقیس زیدی کی آغوش میں تھی اور زیدی کے لب اس کے لبوں پر۔ غیظ و غضب کے عالم میں اس نے ارادہ کیا کہ اسی حالت میں ان کو جاکر گرفتار کرے لیکن بدنامی کے خیال سے رک گئی اور دیر تک مضطربانہ ادھر ادھر ٹہلتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور آخر کار ایک فیصلہ کرکے وہ آہستہ آہستہ نیچے گئی اور وہاں سے کوڈک کیمرا لاکر اس نے وہیں دریچے سے دونوں کی تصویریں لے لیں ——
اور پھر نیچے آکر اپنے خادم رمضانی کو بلایا اور دیر تک کچھ سمجھاتی رہی۔ اس کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں پہونچی اور تھوڑی دیر بعد بلقیس بھی وہاں آئی تو اسے بالکل سکون تھا اور اس کی طرف سے کوئی بات ایسی ظاہر نہیں ہوئی جس سے بلقیس یا زیدی کو کسی قسم کا شبہ پیدا ہوتا

اس واقعے کے تیسرے دن صبح کو مسٹر زیدی اپنے آفس کے کمرے میں بیٹھے ہوئے ڈاک دیکھ رہے تھے کہ رمضانی آیا اور ایک لفافہ ہاتھ میں دے کر بولا کہ "حضور، مجھے کچھ عرض کرنا ہے"

مسٹر زیدی - "یہ لفافہ تو میم صاحب کے نام کا ہے"

رمضانی - "ہاں ہے تو میم صاحب کا لیکن سرکار اسے کھول کر ضرور پڑھیں۔ اسی طرح کے لفافے کئی دن سے ایک آدمی دستی دے جاتا ہے اور ہر دفعہ جب میں میم صاحب کو دیتا ہوں تو کہتی ہیں کہ دیکھو کسی سے ذکر نہ کرنا، یہی آدمی ایک دن جب حضور کچہری میں تھے تین چار کاغذ کے بکس بھی لایا تھا اور چھپا کر میم صاحب کو دے گیا تھا میں نے بارہا ارادہ کیا کہ حضور سے ذکر کردوں لیکن میم صاحب کے ڈر سے ہمت نہ ہوئی۔ اب چاہے مجھے نکالیں یا رکھیں میں نے سارا ماجرا حضور سے کہہ دیا ہے"

زیدی یہ داستان سن رہا تھا اور حیران تھا، وہ کبھی لطیفہ کی طرف سے اس قسم کی بیوفائی کی توقع رکھتا تھا یہ ضرور جانتا تھا کہ وہ آزاد ہے لیکن اخلاقی کمزوری کا وہم وگمان بھی اس کو نہ ہوا تھا، وہ نہ صرف حیران تھا بلکہ غصے کی وجہ سے اس کا چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا، اب اس نے بالکل پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ اسے لطیفہ سے واقعی شدید محبت ہے اور کسی طرح وہ اپنے اس حق کو چھنتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔

رمضانی کے چلے جانے کے بعد اس نے احتیاط سے لفافہ کھولا جس کے اندر ٹائپ کیا ہوا ایک خط رکھا ہوا تھا، اس کا مضمون یہ تھا،

آرام جان!

میں سنا کرتا تھا کہ دیویاں ظالم ہوتی ہیں، لیکن تم تو ایسی نہیں ہو، تمہارا التفات تمہارا لطف وکرم جس وقت یاد کرتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ ان کے مقابلے میں میرا جذبۂ پرستش کس قدر کم وزن نظر آتا ہے۔ اب سے دس دن قبل جب میری نگاہ کا اولین ہدیۂ شوق تم نے اپنی آنکھوں کے تبسم سے قبول کیا تو میں نے جانا کہ ایک انسان کے لیے فردوس صرف یہی ہو سکتی ہے لیکن جب اس کے بعد پے در پے حجابات اُٹھتے گئے اور تمہاری محبت نے اپنی بارش کرم سے مجھے بالکل شرابور کر کے رکھ دیا تو معلوم ہوا کہ :-

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں

میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں تمہارا شکریہ ادا کروں، میرے پاس سوائے جان کے کوئی ہدیہ نہیں کہ اسے پیش کردوں، سو بیس دفعہ کہہ چکا کہ اس سے زیادہ لطف و عنایت کی برداشت مجھ میں نہیں رحم کرو اور جان لے کر اس جھگڑے کو ختم، لیکن تم نے ہمیشہ مسکرا کر ٹال دیا —— کیا کروں حیران ہوں، نہ کسی کام میں جی لگتا ہے نہ رات کو آنکھ بند ہوتی ہے، ہر وقت تم ہو، تمہاری تصویر ہے اور ہر وقت

اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

خدا کرے تم آگ لگانے والی خوش رہو

آج بھی بارہ بجے ٹیلیفون پر آنے کی زحمت گوارا کیجیے، اگر فرصت ہو۔

صرف تمہارا

جمیل

اس خط کو پڑھ کر زیدی کی جو کیفیت ہوئی وہ بیان سے باہر ہے لیکن چونکہ تہذیب جدید کے زیر اثر اس کی تربیت ہوئی تھی اس لیے وہ غیرت تو تھی نہیں کہ فوراً بیوی کا جا کر گلا کاٹ ڈالتا اور جمیل کو ڈھونڈھکر اس کے پیٹ میں چھری بھونک دیتا ـــــ زیادہ سے زیادہ وہ یہی کر سکتا تھا کہ اسے طلاق دے دے اور اس خیال کے آتے ہی اسے ایک گونہ سکون بھی ہوا کیونکہ اس صورت میں وہ بلقیس سے شادی کرنیکے لیے آزاد بھی ہو جائے گا ـــــ چنانچہ وہ اس کے لیے آمادہ ہو کر جانا ہی چاہتا تھا کہ رمضانی پھر گھبرایا ہوا آیا اور بولا کہ حضور نے وہ خط پھاڑا تو نہیں۔ میم صاحب کو کسی طرح معلوم ہو گیا کہ وہ آدمی خط دے گیا ہے، مجھسے پوچھا تو میں نے کہا ہاں دے گیا ہے اور میں ابھی لاتا ہوں کام کی وجہ سے خیال نہیں رہا۔ لائیے وہ خط مجھے دیدیجیے میں لفافے میں احتیاط سے بند کر کے انھیں دے دوں"۔

پہلے تو زیدی کا خیال تھا کہ خود جا کر وہ اس خط کو دے گا اور اسی وقت آیندہ کا فیصلہ کر دے گا لیکن رمضانی کی یہ گفتگو سن کر اس نے تدبیر کی صورت بدل دی اور سوچا کہ زیادہ سے مناسب یہی ہے کہ ٹیلی فون کی گفتگو بھی سن لے، ممکن ہے کوئی اور نیا راز ظاہر ہو ـــــ یہ سوچ کر خط اسنے رمضانی کے حوالہ کیا، اور خود لطیفہ کے نام ایک خط لکھ کر کہ میں ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں شام تک آسکوں گا، چلا گیا۔

ٹھیک بارہ کے ہندسے پر کلاک کی دونوں سوئیاں پہنچی ہی تھیں کہ لطیفہ ٹیلی فون پر گئی اور اکسچینج سے ۶۷ نمبر ملوا کر گفتگو کرنے لگی:۔

ہاں، ہاں..... میں ہوں........ مجھ کیا کم انتظار ہے ....

ضرور........ شام کو........ کس وقت کیا ......

جب آپ فرمائیں ....

یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ زیدی بپھرے ہوے شیر کی طرح پردے کی اوٹ سے باہر آیا اور لطیفہ کے سامنے کھڑے ہو کر بولا:۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ کس سے راز و نیاز کی باتیں ہو رہی ہیں"!

لطیفہ نے مطلقاً کوئی پرواہ نہ زیدی کے آنے کی کی اور نہ اس کے استفسار کی، اس نے اسی طرح ٹیلی فون پر اپنی گفتگو کو جاری رکھا:۔

ہاں آپ کے تحائف ملے۔ کس قدر پاکیزہ تھے ...... خوب میں شرمندہ کر رہی ہوں

جی نہیں معاف فرمائیے ـــــ اس سے زیادہ تکلیف اٹھانے کی اجازت نہیں ـــ

زیدی اس سے زیادہ اپنی توہین کو برداشت نہ کر سکا اور غصے میں بڑھ کر ٹیلی فون اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور بولا کہ "میں حکم دیتا ہوں کہ مجھے اسی وقت اس شخص کا نام بتاؤ جس سے تم گفتگو کر رہی تھیں اور جواب دو کہ تم نے کیوں غیر مرد سے اختلاط پیدا کیا"۔

لطیفہ زیدی کی طرف دیکھ کر مسکرائی اور بولی کہ "میں تمھارا حکم ماننے سے انکار کرتی ہوں اور بتانا چاہتی ہوں کہ میں بھی آزاد ہوں جس سے چاہوں اختلاط کر سکتی ہوں"۔

زیدی۔ "بہتر ہے آپ اپنے کو بالکل آزاد سمجھیں اور اپنے گھر تشریف لے جائیں"۔

لطیفہ۔ "شکریہ، لیکن مہربانی کر کے ایک تحریر مجھے دے دیجیے کہ پانسو روپے ماہوار میرے مصارف کے لیے آپ ماہ بماہ ادا کرتے رہیں گے"۔

زیدی۔ "خوب یہ بدوضعی اور اس پر یہ مطالبہ! قانوناً و شرعاً ایک شوہر بداطوار بیوی کے مصارف کا کفیل نہیں قرار دیا جا سکتا"۔

لطیفہ۔ "اگر آپ کو اس سے انکار ہے تو عدالت اس کا فیصلہ کرے گی اور وہ فیصلہ یقیناً میرے حق میں ہوگا، کیونکہ آپ کے پاس کوئی ثبوت میری بداطواری کا موجود نہیں ہے"۔

زیدی نے غصے سے آگے بڑھ کر وہ خط اٹھا لیا جو سامنے ہی میز پر رکھا تھا، اور بولا کہ "کیا اس سے زیادہ ثبوت تمھاری غداری کا کوئی اور ہو سکتا ہے"۔

لطیفہ نے آہستگی سے میز کی دراز کھولی اور ایک تصویر سامنے رکھ کر بولی کہ "کیا اس سے زیادہ ثبوت تمھاری بدچلنی اور پاجی پن کا کوئی اور ہو سکتا ہے"۔

جس وقت زیدی نے دیکھا کہ یہ تصویر اسی کی تھی جس میں وہ بلقیس کے ساتھ ہم آغوش نظر آ رہا تھا تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور سر سے پاؤں تک عرق عرق ہو گیا،

بلقیس تو اس واقعے کے بعد ہی پونا سے غائب ہو گئی اور اس طرح کہ یہ پتہ بھی نہ چلا کہ کہاں اور کب گئی، لیکن زیدی بدستور اپنی تمام شرمندگیوں کے ساتھ وہیں موجود رہا —— بعد کو جب اسے معلوم ہوا کہ جمیل اور اس کا خط یہ سب فرضی باتیں تھیں اور ٹیلی فون نمبر ۶۷ زنانہ اسکول کا تھا تو زیدی کی خفت کا یہ عالم ہوا کہ اس نے دنوں لطیفہ کو اپنی صورت نہ دکھائی —— اور جب کبھی انتہائی لطف کی حالت میں بھی لطیفہ اس کے چھیڑنے کے لیے ٹیلی فون نمبر ۶۷ کا نام لے دیتی تو وہ جھینپ کر رہ جاتا،

نیاز

اقبالنامۂ جہانگیری کا ایک قلمی نسخہ

اور

عہد مغلیہ کے ایک درباری اہلِ قلم کی چشمدید بیانات

گذشتہ سے پیوستہ

مصوّری وصنعت

معتمد خان نے اس سلسلہ مین دو ایسے دلچسپ واقعات لکھے ہین جو عہد اسلامیہ کی صناعت پر ایک عجیب وغریب روشنی ڈالتے ہین۔

بادشاہ نے شاہ عالم نامی ایک درباری کو ایران کا سفیر بناکر بھیجا تھا جب وہ واپس آئے تو جہانگیر کے حضور مین ایک حیرت انگیز تصویر پیش کی، تصویر کے نقوش یہ تھے،

صاحب قران تیمور لنگ اور القمش خان کی جنگ کا نقشہ تھا اِس جنگ مین جتنے امرار اور صاحبقران کی اولاد تھی تمام لوگون کی تصویرین بنائی گئی تھین، اس نقش مین دو سو چالیس تصویرین تھین مصور کا نام خلیل مرزا تھا چنانچہ اقبال نامہ مین ہے۔

از نفائس ونوادر کہ خان عالم آوردہ بہترین تحفہاے او توان گفت مجلس تصویر جنگ صاحب قران گیتی ستان ست بہ القمش خان شبیہ آن حضرت، واولاد امجاد وامرائے عظام کہ دران جنگ بہ سعادت ہمراہی اختصاص داشتند در زیر ہر صورت نوشتہ کہ شبیہ کیست واین مجلس مشتمل ست بر دو بیست وچہل صورت ومصور نام خود را خلیل مرزا . . . . نوشتہ کارش بغایت پختہ وغالب است کہ بہ قلم استاد بہزاد مناسبت وشباہت تام دارد چون بہ حسب تاریخ از بہزاد . . . . . مقدم است اغلب ظن آنکہ بہزاد از شاگردان اوست

وپرورش اودستی کردہ[1]

معتمد خان نے عہد جہانگیری کے فن مصوری پر مزید روشنی نہین ڈالی حالانکہ جہانگیر کا ذوق مصوری اسقدر بلند سطح کی چیز ہے کہ تاریخ مین اس نے ایک اہم حیثیت پیدا کر لی ہے چنانچہ ای بی ہیول لکھتا ہے

جہانگیر کو اکبر کی صفات عالیہ کا بہت ہی کم حصہ ودیعت ہوا تھا لیکن فنون لطیفہ کے ساتھ اس کی دلچسپی بالکل ویسی ہی تھی جیسی اکبر کی، اس کے "تزک" سے بہت سے ایسے ثبوت ملتے ہین جن سے معلوم ہوتا ہے، وہ اپنے درباری مصورون اور ان کے نقوش ونگار کے ساتھ کیسی گہری دلچسپی اور لگاؤ رکھتا تھا، وہ ان کے ساتھ قریبی دوستون کا سا برتاؤ کرتا تھا اور ان کو ممتاز مراتب عطا کیا کرتا تھا، جہانگیر خود کہتا ہے کہ شریف خاندان بن عبدالصمد کو (عبدالصمد اکبر کے شبیہ طرازون مین سے تھے) جس نے بچپن سے اس کے ساتھ پرورش پائی تھی اس نے اپنی ولی عہدی ہی کے زمانے مین "خان" کا خطاب دیا تھا، اور عہد حکومت مین وزیر اعظم بنا دیا"

جہانگیر "تزک جہانگیری" کے اندر تیرھوین سال جلوس کے سلسلے مین لکھتا ہے:-

آج ابوالحسن نے جس کا خطاب "نادر الزمان" ہے. میرے دربار کی ایک تصویر پیش کی اسے اُسنے "جہانگیر نامہ" کے شروع مین لگایا تھا چونکہ یہ قابل تعریف کارنامہ ہے مین نے اس پر لطف و مہر کیا، اگر اس وقت مشہور ابوالحی اور بہزاد ہوتے تو وہ اس کے لطیف ذوق مصوری کا صحیح فیصلہ کرتے، اس کا باپ آقا رضا میری شاہزادگی کے زمانے مین ہمیشہ میرے ساتھ رہتا تھا اور اس کا یہ لڑکا میرے گھر مین پیدا ہوا تھا، مین نے اسے اچھی تعلیم دلائی یہان تک کہ وہ زمانے مین ممتاز ہستی ہو گیا، اس کی تیار کی ہوئی شبیہین حسین وجمیل ہین منصور بھی فن تصویر کشی کا ماہر ہے، اس کا خطاب "نادر الاصلی" ہے . . . . میرے والد اور میرے زمانہ مین بھی ان دونون مصورون کا کوئی ہمسر نہین[2]

ہیول لکھتا ہے کہ ابوالفضل نے آئین اکبری کے اندر عہد اکبری کے مصورون کی جو فہرست دی ہے اس مین نہ تو ابوالحسن کا نام ہے نہ منصور کا اس لیے معلوم ہوتا ہے اکبر کے آخری زمانۂ حکومت مین ان کی شہرت ہوئی، کلکتہ آرٹ گیلری مین منصور کے کارنامون کے حسین وجمیل نمونے موجود ہیں

---

[1] ایران پر مختلف زمانون مین مختلف قومون نے حکومت کی تیمور اور سلاطین تیموریہ نے ۱۳۶۹ء عیسوی سے ۱۵۰۰ء تک حکومت کی، صفویہ ۱۵۰۲ء عیسوی سے ۱۷۳۶ء عیسوی تک سریر آرا رہے، بہزاد مشہور ایرانی مصور دولت صفوی کے بانی اسمٰعیل اول کے عہد مین ہوا ہے، (دیکھو "پرشین آرٹ" مقالہ تاریخی مرقومہ ڈینیسن راس)

[2] تفصیل کے لیے دیکھو "انڈین اسکلپٹر اینڈ پینٹنگ" مصنفہ ای بی ہیول

جہانگیر کو مصوری کا ایسا اعلیٰ ذوق تھا اور اس کی حیات جمیلہ ایسی لطیف تھیں کہ آج ہم پڑھ کر حیرت مین آجاتے ہین وہ خود لکھتا ہے کہ اگر کوئی مرقع ایسا ہو جس کے مختلف حصون کو مختلف مصورون نے تیار کیا ہو تو مین بتادونگا کہ فلان حصہ فلان مصور نے تیار کیا ہے، خواہ وہ مصور زندہ ہو یا مر گیا ہو

ہیول نے "ایسٹ انڈیا کمپنی" کے معزز عہدے دار "سر ٹامس رو" اور جہانگیر کے ان شرائط کے متعلق تفصیل سے لکھا ہے جو فن مصوری کے متعلق جانبین مین ہوے ٹامس رو نے ایک تصویر پیش کی جہانگیر نے اپنے درباری مصورون سے اسی طرح کے چار مرقع تیار کرائے اور ٹامس رو سے کہا کہ اپنا مرقع پہچان لے لیکن وہ عاجز رہ گیا، جہانگیر نے اس کا مرقع اسے دیا اور اس کے بعد ان کے فرق و امتیاز کے متعلق ایسی ایسی باریک بینیان پیش کین کہ ٹامس رو دنگ رہ گیا،

اسی طرح صاحب اقبال نامہ کا بیان ہے کہ جلوس کے چھٹے سال ایک شاہی غلام نے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی ایک عجیب و غریب صنعت کی چیز پیش کی، اس نے ایک چھڑے کے اوپر ہاتھی دانت سے چار مجلسین مرتب کی تھین جنکی تفصیل حسب ذیل ہے

پہلی مجلس - اس مین پہلوانون کی تصویرین ہین ان مین دو آپس مین کشتی لڑ رہے ہین تیسرا ہاتھ مین نیزہ لیے ہوئے ہے، ایک اور پہلوان زمین پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا ہوا ہے اور اسکے سامنے لکڑی و کمان اور ایک برتن رکھا ہوا ہے

؎۱ فنون جمیلہ کے عنوان سے چونکہ مین ایک بسیط مقالہ لکھ رہا ہون اس لیے یہان ان دقت طلب سوالات پر بحث کرنا نہین چاہتا کہ دربار مغل کی مصوری کیون کر وجود مین آئی، اور اس کے اندر کون کون عناصر کار فرما ہین اس ضمن مین چونکہ تاریخی انقلاب بہت اہمیت رکھتا ہے اس لیے ظاہر ہے کہ چین، ایران اور ہند کے بعض تاریخی واقعات سے نتائج مرتب کرنا ہونگے، ہیول کی کتاب "انڈین اسکلپچر اینڈ پینٹنگ" اور رائل اکاڈیمی کی جدید مطبوعہ "پرشین آرٹ" مین یہ مباحث ملتے ہین کہ ہندوستان نے مغلیہ آرٹ پر کیا اثر کیا اور ایران سے اس کا کیا تعلق ہے۔ اسی طرح جب یہ ثابت ہے کہ فارس پر چین کی مغول قوم نے (جن کی توپیت سے ہندوستان کے سلاطین مغلیہ علاقہ رکھتے ہین) سنہ ۱۲۵۸ عیسوی سے سنہ ۱۳۳۶ عیسوی تک حکومت کی اور تیمور لنگ اور سلاطین تیموریہ سنہ ۱۳۶۹ عیسوی سے سنہ ۱۵۰۰ عیسوی تک فرمان روا رہے، تو مغل آرٹ پر مختلف قومونکی ذہنیت و احساس کی کارفرمائی ایک کھلی ہوئی حقیقت معلوم ہونے لگتی ہے، ہرچند ایرانی مصوری پر یوروپی مصوری کا بھی اثر بتایا جاتا ہے جیسا کہ "لورنس بنیین" پرشین آرٹ مین لکھتا ہے کہ شاہ عباس ثانی نے اپنے ایک مصور محمد زمان کو روم مین بھیجا تھا، جہان وہ عیسائی ہوگیا اور یہ فن سیکھا اس کے بعد وہ ہندوستان آیا اور پھر فارس لوٹ گیا لیکن ہیول اپنی کتاب "ہندستان کی فن سنگتراشی و مصوری" مین اس نظریہ کو نہین مانتا۔ اس نے اس کے خلاف بہت سے دلائل پیش کیے ہین۔

دوسری مجلس ایک تخت بنا ہوا ہے، اور اس پر ایک شامیانہ کھنچا ہوا ہے اس میں ایک امیر آدمی ایک پیر دوسرے پر چڑھائے ہوئے بیٹھا ہے، اور اس کی پشت پر تکیہ بھی نمایاں ہے، اور پانچ خدمت گار اس کے چاروں طرف کھڑے ہیں اور تخت پر ایک درخت کا سایہ پڑ رہا ہے

تیسری مجلس اس میں نٹوں کے کمال فن پر روشنی ڈالی گئی ہے، ایک لکڑی گڑی ہوئی ہے اور اس میں بہت سی رسیاں بندھی ہوئی ہیں، نٹ (رسیمان باز) بائیں ہاتھ سے سر کا پچھلا حصہ پکڑ کر اپنا سر لکڑی پر رکھ کر تماشہ دکھا رہا ہے، ایک شخص گردن میں ڈھول لیے ہوئے بجا رہا ہے، دوسرا کھڑا ہوا رسی کی طرف دیکھ رہا ہے، اور پانچ آدمی تماشا دیکھ رہے ہیں، اور ان میں ہر ایک کے پاس ایک عصا ہے

چوتھی مجلس ایک درخت ہے اور اس کے نیچے حضرت عیسیٰ کی تصویر ہے، ایک شخص آپکے پیر پر سر رکھے ہوئے ہے، ایک بوڑھا آدمی آپ سے گفتگو کر رہا ہے - اور دوسرے چار آدمی کھڑے ہیں

طیور و وحوش جہانگیر کو شکار سے بھی گہری دلچسپی تھی، وہ اپنی دلبستگی کے لیے اکثر سیر و شکار میں مشغول رہتا چنانچہ آج مچھلی کا شکار ہو رہا ہے تو کل آہو کا، آج ہاتھی پھنسائے جا رہے ہیں تو کل شیر پر حملہ ہو رہا ہے، خوفناک چیتے پالے جاتے ہیں اور انھیں آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے، معتمد خاں نے جہانگیر کے ذوق شکار پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ جہانگیر شیر کے شکار اور انھیں پالنے کا بہت ہی دلدادہ تھا،

شیر ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ اثنائے شکار میں ایک شیر درخت کے نیچے بیٹھا ہوا نظر آیا، بادشاہ اور امرا ہمراہ ہیں چاہتے ہیں گھوڑے کی پشت پر بیٹھے ہوئے بندوق سے شیر کا شکار کریں گھوڑا شوخی کرنے لگا، پیادہ ہو گئے اور شیر پر بندوق کا فیر کیا، نہیں معلوم گولی لگی یا نہیں، دوسری مرتبہ بندوق کا فیر کیا گیا، شیر نے اپنی جگہ سے جست کی اور میر شکار کو زخمی کر کے اپنی جگہ پر جا بیٹھا بادشاہ نے بندوق بھر کر "سہ پایہ" (تپائی) رکھا اور انوپ رائے کمر میں تلوار باندھے، ہاتھ میں عصا لیے سہ پایہ کو پکڑے رہا، شاہزادہ خورم بادشاہ کے بائیں جانب تھا، رام داس اور دوسرے خدام و نوکر پیچھے تھے، شیر پھر حملہ آور ہوا، بادشاہ نے جھٹ بندوق کا فیر کیا گولی شیر کے دانت سے ٹکراتی ہوئی گذر گئی، بندوق کی آواز سے شیر اور بھی غضبناک ہوا، جو لوگ نزدیک کھڑے ہوئے تھے تاب نہ لائے، ادھر ادھر بھاگنے لگے جہانگیر بھی لوگوں کے دھکے سے دو تین قدم پیچھے ہٹ کر گر گئے، خود جہانگیر کا بیان ہے کہ اس وقت دو تین آدمی میرے سینے پر پیر رکھ کر گذر گئے، ایک ہندو درباری اعتماد رائے اور کمال قراول نے خود کو سنبھالا اور دوبارہ مستعد ہوئے، شیر نے اس وقت بائیں طرف والے آدمیوں پر حملہ کیا، انوپ رائے نے سہ پایہ چھوڑ دیا

اور شیر کی طرف متوجہ ہوا، اور شیر بھی اس کی طرف جھپٹا، انوپ رائے کے ہاتھ مین جو لکڑی تھی اس سے دو مرتبہ شیر پر دو دستی ماری، شیر نے اس کو زمین پر پچھاڑ دیا اور اسکے دونون ہاتھ منھ مین لے کر چبانے لگا لیکن اس لکڑی اور چند انگوٹھیون کے باعث جو اس کے ہاتھ مین تھین اس کا ہاتھ بیکار نہ ہوا، انوپ رائے شیر کے دونون ہاتھون کے نیچ مین پشت کے بل پڑا ہوا تھا اس نے شیر کے دونوں اگلے پانوں حمایل کر لئے، اسوقت شاہزادۂ خورم نے تلوار غلاف سے نکالی اور چاہا کہ شیر کا کام تمام کرے لیکن انوپ رائے کے ہاتھ کا خیال آیا، تلوار پھینک دی، رام داس نے شیر کو چند زخم لگائے، حیات خان نے سر پر چند ڈنڈے مارے، انوپ رائے پہلو بدل کر اپنے زانو کے زور سے کھڑا ہو گیا، انوپ رائے بھی شیر کے ناخن سے مجروح ہو گیا تھا جب شیر نے اسے چھوڑ دیا اور روانہ ہوا تو انوپ رائے نے بھی غضب مین آکر اس پر تلوار کا وار کیا، پھر دوسرا وار کیا شیر کی دونون آنکھین نکل پڑین، اطراف کے آدمیون نے آکر شیر کا کام تمام کیا، انوپ رائے کو "رائے سکھ دھن" کا خطاب ملا، اور منصب مین بھی اضافہ ہوا، اسی عرصے مین ایک خانہ زاد شیر پر جو بہت قوی ہیکل اور مست تھا، جہانگیر کی نظر پڑی حکم دیا کہ چار نیل گاؤ اس پر باندھے جائیں ہندوستان کے وزن کے مطابق یہ بیالیس من ہوا، شیر نے اٹھایا اور لیکر روانہ ہوا، بادشاہ نے حکم دیا کہ اچھا ایک نیل گاؤ اور اس پر باندھ دیا جائے، اب شیر اتنا بوجھ نہ اٹھا سکا جہانگیر نے کہا اچھا جب کھڑا ہو جائے تو اس پر مزید بوجھ لادا جائے، جب شیر کھڑا ہو گیا تو لوگون نے پانچوین نیل گاؤ کو اس پر رکھ دیا، شیر سب کو اٹھا کر لے چلا۔ یقیناً یہ بوجھ پچاس من سے بھی زیادہ ہو گا۔

اسی طرح شیر دن کی پرورش کے سلسلے مین ایک عجیب و غریب واقعہ مصنف نے لکھا ہے جس کے متعلق خود اس کا خیال ہے کہ

> و این غریب امور است کہ در عہد جہانگیر بادشاہ بہ ظہور آمدہ و در ہیچ عہدے و عصرے نشدہ کہ شیرے بے زنجیر درمیان مردم بگردد، چہاردہ و پانزدہ شیر فقیر دیدہ کہ در فضائے جھرو کہ کہ در طرف دریا بود می گشتند و شیربانان ہمراہ بودہ محافظت می نمودند

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جلوس کے چھٹے سال ایک قلندر نے بادشاہ کی خدمت مین ایک بہت بڑا شیر پیش کیا، یہ شیر جب بچہ تھا تو قلندر کے ہاتھ آگیا، اسی وقت سے اس کی تربیت کی، اس کا نام "لعل خان" رکھا تھا، یہ شیر آدمیون سے اس قدر مانوس تھا کہ کسی کو آزار نہین پہنچاتا تھا، ایک دن جہانگیر نے اسے اپنے سامنے طلب کیا اور ایک گاے کے ساتھ اس کا مقابلہ کرایا بہت سے لوگ تماشہ دیکھنے کے لیے جمع تھے، ایک طرف پہرے دار بھی تماشہ دیکھ رہے تھے، شیر انھین کی طرف دوڑا، ان مین ایک آدمی ننگے بدن تھا، اسے پکڑ کر اس طور سے کلیل کرنے لگا جیسے اپنی مادہ کے ساتھ جفت کرتا ہے، اس کے بعد چھوڑ دیا، اس چوکیدار کو ناخن سے

خراش لگی نہ دانت سے زخم پہنچا، بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے قید سے نکالو، اس کی زنجیرین دور کر دو تاکہ جھروکہ کی فضا مین آزادانہ دریا کے کنارے پھرا کرے۔

بادشاہ کو چونکہ شیرون کی پرورش اور ان کی لڑائی سے خاص دلچسپی تھی اس لیے لوگ اکثر شیر کا بچہ پیش کش کرتے تھے یہ کل شیر بلا زنجیر و پٹکے کے آزادانہ جھروکے کی فضا مین دریا کے کنارے گھومتے پھرتے تھے، اور ہر شیر پر دو شیربان مقرر تھے جو انھین کھانا دیتے تھے، رفتہ رفتہ بڑے بڑے شیر جمع ہو گئے بادشاہ نے کسی کا "مردانہ" نام رکھا تھا کسی کا "فیسل" اور کسی کا "شیر دل" اور انھین باہم لڑاتے، ایک شیرنی نے ان شیرون مین سے ایک سے جفتی کھائی اور بچے دیے، شیرنی نے دودھ پلایا، بچے سیانے ہوئے

انیسوین سال جلوس مین شاہزادہ داور بخش نے جہانگیر کی خدمت مین ایک زرد رنگ کی شیرنی پیش کی جو نر کے ساتھ اس قدر مانوس تھی کہ ایک ہی پنجرے مین رہتی تھی اور عورتون کے ساتھ بھی نہایت محبت اور کلیل کرتی تھی اور جیسا کہ جانورون کا دستور ہے نر کو گود مین لے کر حرکت کرتی تھی، بادشاہ نے حکم دیا کہ نر کو پنجرے سے نکال کر دور چھپا دیا جائے، شیرنی نے بہت فریاد کی حکم ہوا کہ اسی رنگ اور قد و قامت کا ایک دوسرا نر اس پنجرے مین رکھ دیا جائے، شیرنی نے اسے سونگھا اور اس کی کمر پکڑ کر دانت سے توڑ ڈالی، ایک بھینس پنجرے مین ڈالی گئی شیرنی نے اسے بھی فوراً چیر ڈالا اور کھا گئی، اس کے بعد پھر وہی نر پنجرہ مین بند کیا گیا، شیرنی نے اگلے طریقے پر اس کے ساتھ مہربانی اور ہمدردی شروع کی، خود جھٹ لپٹ گئی، اور نر کو سینے پر رکھ کر اس کا منھ چاٹنے لگی، معتمد خان لکھتا ہے،

از ہیچ حیوان اہلی و وحشی تا حال مشاہدہ نہ شدہ کہ دہان جفت خود را بوسہ کند،

چیتہ جہانگیر کو شیر کی طرح چیتہ پالنے کا بھی شوق تھا، جلوس کے سولھوین برس یہ عجیب و غریب واقعہ ہوا کہ ایک نر چیتے نے مادہ کے ساتھ جفتی کھائی اور اس سے بچے پیدا ہوئے۔

اکبر ہی کے زمانے سے شاہی حیوانات کے سلسلے مین نو ہزار چیتے جمع ہو گئے تھے، اکبر کی بڑی خواہش تھی کہ یہ چیتے باہم جفتی کھا کر بچے دین اور اسی غرض سے کئی نر و مادہ چیتون کو بلا قید و بند شاہی باغون مین چھوڑ دیا کہ اپنی خواہش سے جہان چاہیں پھرین، پھر بھی یہ مقصد بر نہ آیا، جہانگیر کے زمانے مین ایک نر چیتے نے زنجیر توڑ کر مادہ سے جفتی کھائی مادہ حاملہ ہو گئی اور ڈھائی ماہ کے بعد تین بچے پیدا ہوئے اور وہ بڑے ہوئے،

فیل بارھوین سال جلوس کے سلسلے مین مصنف لکھتا ہے۔

ایک بار بادشاہ چند مخصوص درباریون کے ساتھ شکار گاہ مین تشریف لیگئے، اس سے قبل پیادے اور

سوارون نے جنگل کو قمرغہ کے شکار کے طریقے سے گھیر لیا تھا، جنگل کے باہر لوگون نے بادشاہ کے بیٹھنے کیلیے ایک درخت پر مچان بنایا تھا، بہت سے امراء نے اطراف کے درختون پر اپنا نشیمن ٹھہرالیا تھا، دو سو نر ہاتھی کمند کے ساتھ اور بہت سی ہتھنیان جمع تھین ہر ہاتھی پر قوم جھرنہ کے دو دو آدمی جنھین ہاتھی کا شکار کرنے مین کمال ہے مقرر تھے، حکم ہوا کہ جنگل سے ہاتھیون کو ہنکا کر ادھر لایا جائے تاکہ بادشاہ سلامت اچھی طرح شکار کا تماشہ دیکھین، اتفاقاً جیسے ہی لوگ جنگل سے نکلے یہان جو لوگ چارون طرف سے رستہ روکے کھڑے تھے، اس سلسلے مین بدنظمی ہوگئی۔ جنگلی ہاتھی پریشان ہو کر ادھر ادھر بھٹک گئے پھر بھی بارہ زنجیر نر و مادہ ہاتھی کا جہانگیر کے سامنے شکار ہوا، ان مین دو ہاتھی بڑے حسین و اصیل ہاتھ آئے۔

آہو جلوس کے چھٹے سال حوالی اکبرآباد کی شکارگاہ مین جو ایک موضع (سموکر) مین واقع ہے جہانگیر تمام اہل محل کے ساتھ سات دن تک عیش ... کرتا رہا، نر و مادہ نوسو ستر آہو کا شکار ہوا جن مین چھ سو ایک زندہ گرفتار ہوے بادشاہ نے ان مین سے چار سو ہرنون کو فتح پور بھیجا کہ چوگان کے میدان مین چھوڑ دیے جائین اور ان کے آب و دانے کا خیال رکھا جائے۔ ایک سو ہرنون کے گلے مین چاندی کا پٹہ دے کر اسی جنگل مین چھوڑ دیا اور باقی ہرنون کو جنھین بندوق لگی تھی، امراء اور تمام خدام دربار کو بانٹ دیا،

مچھلی کے شکار کے متعلق مصنف نے ایک عجیب طریقہ لکھا ہے،

ماہی "ہوتا یہ ہے کہ جہان پر آدمی کے سینے تک پانی ہو، وہان کشتیان لے جاتے ہین اور ان کا ایک سرا دوسری کشتی کے سرے سے ملا دیتے ہین، اور دونون کا دوسرا سرا جو دہ پندرہ گز کے فصل پر رکھتے ہین اور دو ملاح کشتی کے باہر ادھر ادھر لانبی لانبی لکڑیان لے کر ساتھ ساتھ چلتے ہین تاکہ پانی کم و بیش نہ ہو اور دس بارہ ملاح پانی مین اتر کر کشتی کے اس کنارے پر جہان دو کشتیون کا منھ ملا کر ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا جاتا ہے پیر زمین پر مارتے جاتے ہین، جو مچھلی ان دونون کشتیون کے درمیان آجاتی ہے، چاہتی ہے تنگی کے باعث نکل بھاگے، ملاح کا پیر اس سے ٹکراتا ہے دوسرا ملاح اس کی پیٹھ پر بوجھ دے کر زور کرتا ہے تاکہ پانی اسے (مچھلی کو) اوپر نہ لاے، اس طریقہ سے مچھلی پکڑ لی جاتی ہے، جو لوگ اس فن مین مہارت رکھتے ہین وہ بیک وقت دو مچھلیان گرفتار کر لاتے ہین، ایک بوڑھا ملاح ہر غوطے مین دو مچھلیان پکڑ لاتا تھا،

گورخر ایک گورخر کی عجیب و غریب صورت کے متعلق مصنف نے نہایت استعجاب کے ساتھ لکھا ہے اس کے بدن پر اس توازن اور مناسبت کے ساتھ خطوط منقش تھے کہ معلوم ہوتا تھا کسی نے مصوری کی ہے۔

درین دلا گورخرے از راہ دریا آوردہ بودند، بغایت عجیب و غریب، از سرین تا انتہاے دم

وازگوش تا...... خطہاے سیاہ و سفید مناسب جا و مقام کلان ذخور و بہ قرینہ
افتادہ و بر گرد چشم خطے سیاہ در غایت لطافت کشیدہ واز بسکہ عجیب بود۔ بعضے را
گمان آن می ساز دکہ شاید رنگ کردہ باشند بعد از تحقیق و تفحص بہ یقین پیوست
کہ خدا آفرین است،

لنگور گیارھوین سال جلوس مین ایک شخص بہاء الدین برق انداز نے ایک بکری کے ساتھ لنگور کا بچہ جہانگیر کی خدمت مین پیش کیا، بہاء الدین کا بیان ہے کہ ایک مادہ لنگور اپنا بچہ سینے لگائے ہوے ایک بلند شاخ پر بیٹھی ہوئی تھی، بیرحم توپچیون نے اسے گولی ماری مادہ نے بچے کو دوسری ڈال پر رکھ دیا اور خود گر کر مر گئی، اسی وقت مین پہونچا اور اس بچے کو دودھ پلانے کے لیے اس بکری کے پاس لایا خدا نے اس بکری کے دل مین رحم دیا اس نے فوراً اسے چاٹنا شروع کیا اور غیر جنس ہونے کے باوجود اس قدر مالوف ہو گئی کہ گویا لنگور اسی کا بچہ ہے، بادشاہ نے حکم دیا کہ لنگور کے بچے کو بکری کی نظرون سے پنہان کر دیا جائے، بچہ جب نظرون سے اوجھل ہو گیا تو بکری نے بے تابانہ فریاد شروع کی، ادھر لنگور کا بچہ بھی بے تاب ہو کر اس قدر فریاد و نالہ کرنے لگا کہ حاضرین حالت دیکھ کر پریشان ہو گئے،

کتا آٹھوین سال جلوس کے ذیل مین معتمد خان نے ایک دیوانے کتے اور ہاتھی کا ایک خوفناک واقعہ لکھا ہے ایک رات ایک بگلا کتا شاہی فیل خانے مین چلا آیا اور ایک مادہ ہاتھی کے پیر مین کاٹ لیا، ہاتھی نے چنگھاڑنا شروع کیا، محافظ جاگ اٹھے، کتا بھاگ کر ایک زقوم زار مین جو اسی اطراف مین تھا چھپ گیا ایک عرصے کے بعد پھر فیل خانے مین پہونچا اور ہاتھی کے اگلے پیر مین کاٹ کھایا ہاتھی نے اسے پیر سے کچل ڈالا اس واقعے کو ایک ماہ پانچ دن گذر گئے، ایک دن جب کہ پانی برس رہا تھا، بجلی چمک رہی تھی رعد گرج رہا تھا ہوا تیز و تند چل رہی تھی ہاتھی نے چنگھاڑنا شروع کیا، اور اس کے تمام جسم مین کپکپی شروع ہو گئی، زمین پر گر پڑا اور بڑی سخت محنت کے بعد اٹھا، سات دن تک برابر اس کے منھ سے لعاب نکلتا رہا کھانا پینا چھوڑ دیا رات دن اسی تباہ حالی سے بسر کر رہا تھا ساتوین دن جان دی اس واقعے کے ایک ماہ کے بعد ایک بڑے ہاتھی نے بھی جس دن رعد و برق اور بارش و طوفان تھا شور مچانا شروع کیا، آخر کار اس کے جسم مین رعشہ ہونے لگا اور منھ سے پانی نکلنا شروع ہوا اور اسی طرح مر گیا، اللہ نے ہر مرض کی دوا پیدا کی ہے، علاج کی کوشش کی گئی لیکن نہ کوئی دوا ملی نہ منتر،

سارس جہانگیر کو وحوش کی طرح طیور کے ساتھ بھی بڑی دلچسپی تھی چنانچہ اس نے تزک جہانگیری مین ایک ترکی مور کے متعلق تفصیل کے ساتھ لکھا ہے اور اسی کے ساتھ اپنے درباری مصور سے شبیہ بھی تیار کرا کے

مضمون کے ساتھ لگا دی ہے، ای. بی. ہیول نے جہانگیر کے اس مقالے کا انگریزی مین ترجمہ درج کیا ہے اور اسی کے ساتھ جہانگیر کا تیار کرایا ہوا وہ مرقع بھی لگا دیا ہے۔

ای بی ہیول لکھتا ہے،

ایک ترکی مور کا مرقع غالبًا منصور کا دوسرا کارنامہ ہے، اس پر بھی جہانگیر کی مہر لگی ہوئی ہے، اور اس کی تاریخ بھی جہانگیر نے اپنے روزنامچہ کے اندر ساتوین سال جلوس کے سلسلے مین لکھی ہے جیسا کہ "واقعات جہانگیری" مین درج ہے، "مقرب خان جو گوا کی طرف بھیجا گیا تھا، واپسی کے وقت شہنشاہ کے لیے بہت سے نوادر خرید کر لایا، جہانگیر کہتا ہے، اس مین بعض جانور ایسے تھے جنھون نے میرے اندر ایک حیرت انگیز دلچسپی پیدا کر دی اور جنھین مین نے قبل کبھی نہ دیکھا تھا، بابر نے اپنے روزنامچہ کے اندر بہت سے جانورون کی قابلانہ تصریح اور ان کی شبیہین پیش کی ہین لیکن غالبًا گمان یہ ہے کہ انھون نے مصورون سے جاندار جانورون کی تصویرین تیار نہین کرائین لیکن میرے سامنے جو جانور موجود ہین وہ عجیب ندرت رکھتے ہین، مین نے ان کی تصریح کی اور حکم دیا کہ ان کی تصویرین تیار کرا کے جہانگیر نامہ مین لگائی جائین تاکہ ان کی حقیقی مثال دیکھ کر پڑھنے والے محض لفظی تفصیل کی بہ نسبت زیادہ متعجب ہون"۔

ان طائرون مین مورنی کی شکل کی ایک چڑیا ہے، لیکن جثے مین اس سے کچھ بڑی اور مور سے چھوٹی ہے، جب اسے جفتی کھانے کی خواہش ہوتی تو وہ اپنا دم اور پر پھیلا کر مور کی طرح ناچتی، اس کا منقار اور پنجہ مرغ کی طرح ہے ہر منٹ پر اس کے سر، گردن اور حلق کا رنگ بدلتا رہتا ہے لیکن جفتی کھانے کے لیے جب زیادہ بیتاب ہو جاتی ہے تو مونگے کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتی، تھوڑی دیر کے بعد وہ ایسی سفید ہو جاتی جیسے روئی اور بعض اوقات اس کا رنگ بالکل آسمانی ہو جاتا مختصر یہ کہ اس کا رنگ گرگٹ کی طرح بدلتا رہتا، گوشت کا حصہ جو اس کے سر کے ساتھ چسپان ہے تاج خروس کی طرح معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے جسم کا عجیب و غریب حصہ وہ تھا کہ جب وہ جفتی کھانے کے لیے ہوتی تو ہاتھی کی سونڈ کی طرح ایک بالشت لٹکتا رہتا اور جب اپنی جگہ پر آجاتا دو انگل سر کے اوپر بلند ہوتا، اس جانور کی آنکھون والا حصہ برابر آسمانی رنگ کا رہتا اور اسمین کوئی تغیر نہین ہوا کرتا بازو کا یہ حال نہ تھا، اس کا رنگ مور کے برعکس بدلتا رہتا"۔

ای. بی ہیول لکھتا ہے کہ جہانگیر نے جس جانور کی تفصیل لکھی ہے اس کا نام اس مقالہ کا مترجم "ترکی مور" بتاتا ہے اور یہ حیرت کی بات ہے کہ خود ترکستان مین اسے ہندوستان کی طرف منسوب کیا جاتا ہو وہان اسے "ہندوغی" کہتے ہین [۱]۔

---

[۱] تمام تفصیلات کے لیے دیکھو "انڈین اسکلپٹر اینڈ پینٹنگ" مصنفہ ای. بی. ہیول،

کائنات کے اجزائے ترکیبی مین جذب وکشش کو جو دخل ہے وہ سائنس کی مشہور حقیقت ہے بزم کائنات کے اسی رمز کو جان لینے کے بعد صوفیہ نے عشق وجمال پر اپنی طریقت کی بنیاد رکھی، کائنات کا ہر ذرہ حسن کا جلوہ زار ہے، حیات کی ساری دنیا مین موج عشق کی بیتابیان ہین

ہے ننگ سینہ دل اگر آتش کدہ نہو ہے عار دل نفس اگر آذر فشان نہین

معتمد خان نے سارس کے عشق کا ایک حیرت انگیز واقعہ لکھا ہے، یہ قصہ خیالی نہین اس لیے اگر آپ اس سے کوئی روحانی لذت لینا چاہتے ہین تو اسے افسانہ نہ سمجھیے بلکہ حقیقت جان کر پڑھیے اسے حقیقت سمجھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ای بی ہیول نے اپنی کتاب مین عہد مغلیہ اور خصوصیت کے ساتھ عہد جہانگیری کے عجیب وغریب طیور کی تصویرون کے متعلق جو حالات لکھے ہین ان مین ایک بڑے سارس کا مرقع بھی لگایا ہے جو نہ صرف فن مصوری کے اعتبار سے قابل قدر چیز ہے بلکہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ سارس وغیرہ کا قصہ جو معتمد خان نے لکھا ہے صحیح ہے۔ اقبال نامہ مین ہے،

واز موانست ومحبت سارس باجفت خود نقلہائے غریب برزبان جاریست
قیام پسر شاہ محمد قندھاری کہ قراول بیگی حضرت شاہنشاہیست درخدمت شاہی نقل کرد[1]

معتمد خان نے واقعہ بیان کرنے سے قبل راوی کا نام اور موقعہ بیان بھی نقل کردیا ہے، قیام نامی شاہی قراول نے جہانگیر کی خدمت مین اپنا ذاتی مشاہدہ بیان کیا کہ

مین نے شکار کرتے وقت ایک سارس کو دیکھا جو کہ ایک درخت کے نیچے بیٹھا ہوا تھا، مین نے چاہا کہ بندوق سے شکار کرون اس ارادے سے چند قدم آگے بڑھا کہ جب کھڑا ہو تو اسے گولی مارون لیکن مجھے حیرت ہوئی جب اس نے مطلق حرکت نہین کی مین اس کے نزدیک ہوتا گیا مگر اس مین ذرا وحشت پیدا نہین ہوئی مین نے دل مین کہا شاید بیمار ہے جب مین اس کے پاس آیا تو اس کا پر پکڑ کر اٹھایا، اسقدر ہلکا تھا کہ گویا اس کے بدن مین ایک مثقال بھی گوشت نہو گا، دو تین قدم ڈگمگاتا ہوا چلا اور گر کر مرگیا، جب مین نے اچھی طرح سے اسے ملاحظہ کیا تو دیکھتا ہون اس کے سینے مین کیڑے پڑے ہین اور جگر تحلیل ہوگیا ہے، جہان پر بیٹھا ہوا تھا ایک مردہ سارس کی چند ہڈیان نظر آئین جنھین یہ بال و پر کے نیچے دبائے بیٹھا تھا[2] معلوم ہوا کہ سینے کے اندر اپنے جوڑے کی ہڈیان لیے تھا،" آہ غالب نے شاید کسی عاشق کی اسی لطافت حسن کی طرف اشارہ کیا تھا،

---

[1] اقبال نامہ وقایع سال یازدہم [2] مین نے اپنی آنکھون سے پھلواری کے متصل ایک تربکڑ دری جیک کمیدان مین

بقیہ حاشیہ بر صفحہ ۳۹

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے
دلِ افسردہ گویا حجرہ ہو یوسف کے زندان کا

جہانگیر مالوے کی طرف جا رہا تھا، اثنائے راہ مین ایک خواجہ سرا سارس کے دو بچے پکڑ کر لایا، جب بادشاہ شکار سے واپس آیا تو سارس کا ایک جوڑا شاہی خلوت خانے کے نزدیک بے وحشت و خوف آکر بیٹھ گیا اور مظلومانہ انداز سے فریاد و فغان شروع کی بڑی جستجو کی گئی خواجہ سرا بچون کو بادشاہ کے حضور مین لایا، بچون کو دیکھ کر وہ بے تابانہ ان کے نزدیک آئے اور اس خیال سے کہ انھون نے کچھ کھایا نہو گا اپنے منھ سے کچھ نکال کر بچون کے منھ مین کھلانا شروع کیا اور بڑے شوق کے ساتھ بچون کو درمیان مین لے کر آشیانہ کی طرف اڑ گئے

(اقبالنامہ وقایع سال یازدہم)

گورتیا جہانگیر ایک مرتبہ اجمیر سے کشمیر جا رہے تھے، تھانیسر کے اطراف مین خود مصنف کے ایک خواجہ سرا نے ایک جنگلی گورتیا کا بچہ پکڑ لیا، اس کی مان بھی فریاد کرتی ہوئی ساتھ آئی، خواجہ سرا نے بچے کو پنجرے کے اندر بند کر دیا، اور پنجرے کو اپنے سے کچھ دور رکھا، اس کی مان جنگل مین جاتی تھی اور چارہ لا کر اس بچے کو کھلاتی تھی دوسرے دن جب کوچ ہونے لگا تو اس کی مان بھی ساتھ ہو گئی اور اگلے دنون کی طرح بچے کو چارہ لا کر کھلاتی رہی جب یہ خبر مصنف کو معلوم ہوئی تو اس نے خواجہ سرا سے کہا کہ بچے کو ہاتھ پر رکھ لے، مان آئی پہلے دو تین مرتبہ بچے کے چارون طرف اڑی اس کے بعد بے تابانہ وہ بھی ہاتھ پر آ کر بیٹھ گئی اور اسی طرح چودہ منزل تک لشکر کے ساتھ رہی یہان تک کہ بچے مین کچھ قوت آگئی، مان اسے اڑا کر اپنے ساتھ لے گئی،

ہُما معتمد خان نے ہما کا تذکرہ بہ تفصیل لکھا ہے، ہما ہماری فارسی شاعری مین رمزیات و استعارہ اخلاقی موعظت کا موضوع قرار پا گیا ہے بعض محققین کا خیال ہے کہ فارسیون نے یہ خیال اساطیر و اوہام سے لیا ہے چنانچہ سعدی کے اس شعر

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳) ایک سانپ کا نہایت ہی حیرت انگیز واقعہ دیکھا کسی سپہر نے ایک دعامن سانپ کو مار ڈالا تھا اس کی مادہ تین چار دن تک اس کی لاش کے گرد رقص کرتے کرتے مر گئی مین جس وقت پہونچا دو یا تین دن ہو چکے تھے لاش سے بدبو نکل رہی تھی، دیہاتی حلقہ باندھے کچھ کھڑے تھے بعض بیٹھے تھے، معتقدین نے پھول چاول دودھ چڑھایا تھا، لوگ جوق جوق آ رہے تھے لوگون کا بیان تھا کہ متعدد بار اس مادہ سانپ کو اس جگہ سے ہٹا کر دور رکھ دیا گیا لیکن رات کے وقت پھر آگئی، لوگون نے منھ کھول کر دودھ وغیرہ دینا چاہا لیکن اس نے نہین پیا مردہ سانپ کے گرد بے تابانہ طواف کر رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے منھ سے ایک کراہ کی آواز نکلتی تھی یہ عجیب تماشہ خود میری آنکھون نے دیکھا اور آج تک مجھے اس واقعے پر سخت حیرت ہے سننے مین آیا ہے کہ چار یا پانچ دن تک خواب و خور ترک کرکے وہ مادہ اپنے جوڑے پر نثار ہو گئی سنا ہے ہندوون نے وہان "ستی" کی ایک یادگار بنائی ہے

کس نیاید بزیر سایۂ بوم ور ہما از جہان شود معدوم

کے اندر یہی اساطیری فکر و احساس کام کر رہا ہے ہر چند غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ سعدی ہما کے متعلق اپنا ذاتی عقیدہ نہیں بیان فرما رہے ہیں بلکہ انھوں نے اپنے اخلاقی بیان میں ایک مشہور خیال سے تمثیل دیدی ہے ہما کے متعلق جو عقیدت مندیاں پائی جاتی ہیں انکا اساطیری پہلو کتنا ہی مضحکہ خیز کیوں نہو لیکن خود وجود ہما سے انکار کر دینا تاریخ طبعی کے عمیق مطالعہ پر مبنی نہیں مصنف لکھتا ہے

بتاریخ نوزدہم شہر محرم الحرام ہزار وسی و پنج ہجری از کشمیر متوجہ دار السلطنت لاہور شدند پیش ازین مکرر بعرض رسیدہ بود کہ در کوہ پیر پنجال جانورے می باشد مشہور بہ ہمائے و مردم این سرزمین می گفتند کہ طعمہ اش استخوان است و پیوستہ بر روئے ہوا پر واز کنان مشاہدہ می انند، نشستہ کم بہ نظر آمدہ چون خاطر اشرف اعلی حضرت شاہنشاہی بہ تحقیق این مقدمات توجہ مفرط دارد حکم شد کہ از تراد لان ہر کس تفنگ زدہ بحضور بیارد پانصد روپیہ انعام می فرمایم قضا را جمال خان قراول بہ بندوق زدہ بحضور اشرف آورد، چون بپایش رسیدہ بود زندہ تندرست بنظر در آمد . . . . از حوصلہ اش استخوان ریزہ بر آمدہ و مردم این کوہستان معروض داشتند کہ مدار خورو نش باستخوانست ہمیشہ بر روے ہوا پرواز کنان چشم برزمین دارد و ہر جا استخوانے بہ نظرش در آمد بہ نول خود گرفتہ بلندی می شود و ازان جا بر روے سنگ می اندازد تا بشکند و ریزہ ریزہ شود، آنگاہ می چیند و می خورد درین صورت غالب ظن آنکہ ہمائے مشہور ہمین باشد چنانکہ گفتہ اند،

ہمائے بر ہمہ مرغان ازان شرف دارد کہ استخوان خورد و طائرے نیازارد

در جثہ و ترکیب بہ عصبات شباہت دارد و سر و نولش بشکل مرغ می نماید لیکن بہ شکل مرغ پر نہ دارد و این پرہائے سیاہ براق در حضور وزن فرمودند چہار صد و پانزدہ تولہ کہ یک ہزار وسی و ہفت و نیم مثقال باشد بہ وزن در آمد[1]

(اقبالنامہ جہانگیری وقایع سال نوزدہم) (باقی)

عبدالمالک

[1] ہم لوگون کے موجودہ وزن کے مطابق پانچ سیر تین چھٹانک ہوا،

قصر شیرین

قصر شیرین سرحد ایران پر دولت عجم کا پہلا شہر ہے جہان تک پہنچتے پہنچتے کھجور کے درخت بالکلیہ غائب ہو جاتے ہین اگرچہ قزل رباطسے آگے ہی عربی زبان بہت کم سنائی دیتی ہے مگر قصر شیرین میں شاید ہی دو چار عربی سمجھتے ہون ورنہ تمام تر فارسی اور کُردی بولتے ہین، فارسی اور کُردی زبان مین وہی فرق ہے جو لکھنؤ کی شہری اردو اور ہمارے پورب کی دیہات کی بولی مین فرق ہے، کُردی اس حیثیت سے صرف گنوارون اور دیہاتیون کی زبان پر جاری ہے، مہذب آدمی ہمیشہ کردی بولنے سے شرماتا ہے اور فارسی مین گفتگو کرنے کو ترجیح دیتا ہے، فارسی اور کردی زبان کا فرق ذیل کی چند مثالون سے عیان ہوگا، مثلاً

فارسی	کُردی
مرحبا، بسر وچشم آمدی	مرحبا، بان چاؤ باتوی
خانہ شما کجاست	مال توکوا
این راہ بکجامی رود	این ریہ گالہ کواروی
من گرسنہ ہستم	من برسیم
من تشنہ ہستم	من تینیتم

قصر شیرین مین میرا قیام بحیثیت ڈپٹی اسسٹنٹ پولیٹکل افسر اس عمارت مین تھا جس کو سرباز خانہ کہتے ہین اور جو ایک بڑے بارک کے طرز کی عمارت ہے، روسیون کے ہاتھون قصر شیرین کی بربادی سے پہلے (جس کی وجہ سے تمام قصر شیرین تقریباً ویران پڑا ہوا ہے اور اب از سر نو تھوڑا تھوڑا آباد ہو رہا ہے) اسی عمارت مین ایرانی سرحدی فوج کا ہیڈ کوارٹر تھا، جب ترکون کے بعد روسی فوج قصر شیرین مین داخل ہوئی تو عمارت کے تمام کواڑ اور دھنیان نکال کر جلانے کی لکڑی کے کام مین صرف کی گئین اور اب یہ تمام عمارت بالکل ویران پڑی ہوئی ہے بجز ان تین چار کمرون کے جن کو مینے اپنے قیام کی وجہ سے وقتی طور سے درست کرا لیا ہے، چنانچہ رات کے وقت

نیچے دریائے حلوان کی شورش اور بوسیدہ مکان میں میرے کُردی گارڈ کا آوازہ[1] اور بقیہ کھنڈروں میں گیدڑوں کی ہاؤ ہو سے عجیب ڈراؤنی قسم کی چہل پہل پیدا ہو جاتی ہے لوگوں کا بیان ہے کہ میرے کمرے کے بالکل نیچے وہ کمرہ ہے جس میں روسیوں نے مقتول ایرانیوں کی بہت سی لاشیں پھینکی ہیں اور سناٹے میں اس کوٹھری سے آہ و بکا کی آواز سنائی دیتی ہے، سرباز خانہ ایک اونچی پہاڑی کے ٹیلے پر واقع ہے جس کے نشیب میں ایک طرف مکانات اور بازار پھیلے ہوئے ہیں اور دوسری طرف دریائے حلوان بہتا ہے قصر شیرین میں جو کچھ درخت یا سبزہ یا کھیت ہے وہ صرف دریائے حلوان کے کنارے کنارے تھوڑی دور تک پایا جاتا ہے دریا کے پار ایک بڑا باغ باغ شاہی کے نام سے مشہور رہے، جہاں مختلف قسم کی سبزیاں، انجیر، میٹھے اور ترش لیموں دستیاب ہوتے ہیں اس کے علاوہ قصر شیرین کے چاروں طرف بالکل سناٹا ہے اور چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے خشک سلسلے بے ترتیب ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں، سرباز خانہ کے قریب ایک پہاڑی کا زیادہ حصہ سفید ہے جس پر پہلے مجھے سنگِ مرمر کا دھوکا ہوا مگر بعد کو معلوم ہوا کہ یہ صرف چونے کے کام میں آتا ہے

قصر شیرین کا بازار اور شہر قابل ذکر نہیں، زیادہ تر عمارتیں کچی سفالہ پوش اور شکستہ ہیں، دکانیں دو چار بقالوں اور چند بزازوں کے سوا کچھ نہیں، بازار کے آخری سرے پر ایک بڑی دو منزلہ ایرانی عمارت ہے جو زمانۂ جنگ سے پہلے یہاں کا سرکاری مدرسہ تھا، مگر روسیوں نے اس کو بالکل تباہ و برباد کر دیا ہے، باہر کی دیوار جو دریا کی جانب ہے گولیوں سے چھلنی ہو رہی ہے، روسی غریب کردوں اور ایرانیوں کو پکڑ کر اسی دیوار کے قریب کھڑا کر کے باغ شاہی سے اپنے نشانے کی مشق کیا کرتے تھے اور لاشوں کو حلوان میں بہا دیتے تھے، اس سے آگے ایک کہنہ و شکستہ قلعہ ہے جو قلعہ جوان میر کے نام سے مشہور ہے یہ بھی سرباز خانہ کی طرح ایک بلند ٹیلے پر بنایا گیا ہے اور نہایت مستحکم پتھر کی عمارت ہے قلعے کے اندر کی عمارتیں جواب گر رہی ہیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ انکا بنانے والا تمدن جدید سے متمتع ہونے کا اہل تھا، جوان میر ایک کردی قبیلہ ہماوند نامی کا سرگروہ تھا، قزاقی اس کا پیشہ تھا اور ایک عرصے تک ایرانی حکومت اس سے سخت نالاں رہی حتی کہ عوام کی روایت کے مطابق ایک بار شاہ ناصر الدین کی لڑکی کو جو کربلا کی زیارت کو جا رہی تھی اس نے پکڑ کر اپنے پاس بطور یرغمال کے رکھ چھوڑا۔ جب تک پادشاہ بغداد اس کی پشت پناہی پر تھا ایرانیوں کو ہمیشہ پریشان کرتا رہا، مگر جب پاشا سے بھی ناچاقی ہوئی تو ایرانیوں نے اس پر قابو پا کر قتل کر ڈالا اور اس کے مشہور قلعے کو مسمار کرا دیا،

قلعہ جوان میر کے آگے ایرانی گرگ خانہ ایک اچھی اور معقول عمارت تھی مگر ترکوں اور روسیوں کی کشمکش میں

---

[1] آوازہ کردی گیت جو رات کو پاسبان گاتے ہیں،

بالکل تباہ و برباد ہو گئی اور اس کے تمام در و دیوار شکستہ حالت مین پڑے ہوے تھے قلعہ جوان میر، گرگ خانہ، سرباز خانہ اور مکتب ایرانی یہ سب قصر شیرین کی پبلک عمارتین ہین، گرگ خانہ اور قلعہ جوان میر مین مکانون کے اندر تہ خانے بنے ہوے ہین اور صحن مین حوض و فوارے کے نشانات پائے جاتے ہین، جس کے چارون طرف کشادہ اور ہوادار دالان بنے ہوے ہین سرباز خانہ کی کوٹھری کے اندر ایک آتش دان اور چھت مین ہوا کے لیے جدید اصول پر روشن دان بنے ہین، اُنکی تمام کھڑکیان دریاے حلوان کی طرف کھلتی ہین جہان سے دریا اور پھر دور کی بلند پہاڑیون کا نہایت عمدہ منظر سامنے رہتا ہے

آثار قدیمہ مین شیرین کا محل جس کو یہان چار قاپی یعنی چار دروازہ (ترکی مین قاپی یا قپو دروازے کے معنی مین آتا ہے) ایک مربع اونچی عمارت ہے اور اس کے پاس ایک سلسلے مین اور بھی بہت سی چھوٹی عمارتین ہین، یہ سب عمارتین بلا تراشے ہوے پتھر کی بنی ہوئی ہین مگر اب پتھرون کے ڈھیر ہو رہے ہین اور پراگندہ پتھرون کو موجودہ آبادی اپنے مکانون مین لگانے کے لیے اٹھا کرلے جاتی ہے، چار قاپی کے اندر ایک بڑے حوض کے نشانات پائے جاتے ہین۔ مکان کی دیوارون پر کوئی کتبہ یا نشان رہا ہو گا مگر اب سب مٹ گئے ہین، اندر کئی جگہ جنگلی کبوترون نے گھونسلے بنا لیے ہین دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرہ مین لکھا ہے کہ اس محل کے اندر یہ قدیم شعر کندہ تھا؛

ہژبرا بگیہان انوشہ بدے　　جہان را بدیدار نوشہ بدے

اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ عضد الدولہ دیلمی کے زمانے تک بروایت ابوطاہر قانونی یہ کتبہ موجود تھا، یہ پہلا شعر ہے جو ایران مین قبل اسلام معلوم ہوا ہے، قصر شیرین کا ویرانہ دو میل کے دور مین پھیلا ہوا ہے اور چارون طرف شہر پناہ کے نشانات معلوم ہوتے ہین، تاریخ عرب مین اس نام کا کوئی شہر نہ تھا بلکہ جہان پر قصر شیرین ہے وہان ایک بڑا شہر حلوان آباد تھا اور ممکن ہے کہ یہ تمام ویرانہ اسی حلوان شہر کا ہو۔ دریا اس ویرانے سے دور ہٹ گیا ہے۔ اور زمین رفتہ رفتہ بلند ہو گئی ہے اور اب تمام میدان خشک و بے برگ و گیاہ ہے؛

قصر شیرین کے قریب ایک مقام چاہ سرخ سے مٹی کا تیل نکلتا ہے، اب انگریزون نے اس پر قبضہ کر کے عراق کی سرحد مین شامل کر لیا ہے، بالفعل تیل نکالنے کا اجارہ حکومت سیاسی عراق کی طرف سے قصر شیرین کے ایک بہت بڑے تاجر یہودی کو دے دیا گیا ہے، جو ڈرمون سے کثیف تیل بھر وا کر گدھون پر قصر شیرین لاتا ہے اور سرباز خانہ کے نیچے ایک مکان مین پرانے طریقے سے صاف کرا کر بازار مین فروخت کرتا ہے یہ صاف شدہ تیل مین بھی نوج کے لیے خریدتا ہون خاصا کام دیتا ہے،

قصر شیرین کی موجودہ آبادی تقریباً دو سو مکانون پر مشتمل ہو گی، یہان کے مالدار عموماً یہودی ہین جنکی طرز معاشرت بالکل ایرانیون کی طرح ہے اور انھین کی طرح مرزا اور خان کا لقب خود استعمال کرتے ہین اگرچہ مسلمان ہمیشہ ان کو خواجہ کا لقب دیتے ہین۔

یہودیون مین سب سے زیادہ متمول اور جو خود ہماری فوج کے ٹھیکے دار ہین خواجہ ہارون وعزیز وخواجہ داؤد ہین یہ تینون بھائی ہین یہ لوگ زمیندارون اور سرداران قبائل سے سبزی میوہ گیہون۔بھیڑ بکریان کم دامون پر خرید کرکے ہمارے ہاتھ دہ چند قیمت پر فروخت کرتے ہین

ایران کے شہرون مین جو بات سب سے زیادہ عجیب نظر پڑتی ہے وہ کلاہ ایرانی ہے، ہمارے یہان کے ایک بہت بڑے دیگچے کو جس مین پانچ سیر چاول پک سکتے ہین الٹ کر سر پر رکھ لو تو وہ ایک قسم کی ایرانی ٹوپی ہو جائے گی، ایک دوسری وضع کی ٹوپی تقریباً ایک ہاتھ لانبی ہوتی ہے جو نیچے سے نصف فٹ دور مین شروع ہو کر اوپر چندوے کے پاس دو فٹ کے دور مین ہو جاتی ہے، نیچے کی گولائی مین بالعموم شوقین مزاج لوگ رنگین ریشمی رومال لپیٹ لیتے ہین، ایک تیسری قسم کی ٹوپی کی بالکل کاسۂ سر کے ڈھانچے پر بنائی جاتی ہے جو سر کی پوری گولائی کو حلقہ کر لیتی ہے، چوتھی قسم کی مہذب ٹوپی جو عموماً یورپین فیشن والے ایرانی زیب سر کرتے ہین وہ ہمارے ہندوستان کے ہندؤن کی فلٹ کیپ کی خواہر بزرگ معلوم ہوتی ہے، ایک قسم کی اور ٹوپی میرے دیکھنے مین آئی ہے جسے اکثر شکاری پہنتے ہین اس مین سامنے انگریزی ٹوپی کی طرح چھجا نکلا رہتا ہے اور جرمن سپاہیون کے ہیلمٹ سے زیادہ مشابہ ہوتی ہے، ٹوپیون کے بعد متوسط طبقے کے ایرانیون کا لباس عربون کی طرح زبول اور عبا ہوتا ہے۔ لیکن زبول بے رنگ نہین ہوتا بلکہ سرون کے شلوار کو، جو عموماً نیلے رنگ کا ہوتا ہے نمایان کرتا رہتا ہے، یہ شلوار اکثر بڑے پائنچے کا پائجامہ ہوتا ہے جسے لکھنؤ مین اکثر پرانے فیشن کی عورتین پہنتی ہین ایرانیون کا جوتا غالباً ان کے لباس مین سب سے اچھا ہوتا ہے اگرچہ پائدار نہین ہوتا، اس کی ساخت اور ہمارے یہان کے کریپ سول جوتے کی ساخت مین بہت کم فرق ہوتا ہے پتھریلی زمین اور کیچڑ مین چلنے کے لیے بہت آرام دہ ہوتا ہے، مین نے اکثر عورتون کو دیکھا ہے کہ جراب کی طرح شوقیہ فرصت کے وقت اس کو بنا کرتی ہین۔

جس زمانے مین مین قصر شیرین مین آیا تھا وہ جون جولائی کا مہینہ تھا، اور عراق کی طرح ان دنون یہان بھی سخت گرمی پڑ رہی تھی، لوگ زیادہ تر چھت پر سوتے تھے، نومبر سے کچھ کچھ سردی شروع ہو جاتی ہے، اور ان ایام مین بارش بھی ہوتی ہے، دسمبر، جنوری اور فروری کے ایام مین اگر بارش نہ ہو تو موسم بالکل ہندوستان کا سا رہتا ہے قصر شیرین کی آب وہوا بجز جون، جولائی کی سخت گرمی کے ہمیشہ ہندوستانیون کے لیے معتدل رہتی ہے اگرچہ صحت بخش نہین ہے مین خود گرمی بھر بخار مین مبتلا رہا، اور یہی حال تقریباً آدھے سے زیادہ فوجیون اور یہان کی آبادی کا تھا، میرا خیال ہے کہ یہ زیادہ تر عوام کی غلاظت وگندگی کے سبب سے ہے یہان گھرون مین ادب خانے (پاخانے) نہین ہوتے، لوگ باہر میدان مین جا کر حوائج ضروری سے فارغ ہوتے ہین، مجھے خود اپنے کوڈ کی صفائی کے لیے فوج سے ایک مہتر بلانا پڑتا تھا لوگ اپنی بدتمیزی سے حوائج ضروری کے لیے دریا کے کنارے بلکہ اکثر شہر کے اندر سڑکون پر بیٹھ جاتے ہین اور سارا شہر غلاظت سے

متعفن رہتا تھا، میرا معمول تھا کہ صبح اٹھ کر حلوان کے ٹھنڈے پانی میں غوطہ لگایا کرتا مگر جب کئی بار غلاظت سے پاؤں آلودہ ہو گیا تو میں ایسا گھبرایا کہ آخر کار مجبوراً اس لطف کو چھوڑنا پڑا،

قصر شیرین میں میں نے نہ کوئی مسجد دیکھی اور نہ اپنے ایام قیام میں کبھی اذان کی آواز سنی اسکا سبب غالباً یہ تھا کہ آبادی میں زیادہ حصہ شیعوں کا ہے مگر افسوس کہ دار الاسلام میں خاص شعائر اسلام کا رواج نہیں، میں نے سنا ہے کہ یہاں کوئی حمام بھی نہیں اور چونکہ اس ملک کا طریقہ یہ ہے کہ نہانے کا انتظام بھی گھر سے باہر حمام میں ہوا کرتا ہے اسلیے غالباً یہاں لوگ طہارت کو بھی ضروری نہیں سمجھتے۔

ترکوں اور روسیوں کے زمانۂ قیام قصر شیرین میں یہاں کی غریب آبادی پر جو ہولناک مظالم کیے گئے تھے ان کی شہادت صرف در و دیوار کی شکستگی سے نہیں بلکہ خود بقیۃ السیف آبادی کی زار و نزار حالت سے بھی ملتی ہے۔ مسلمان غالباً معترض ہوں کہ میں روسیوں کے ساتھ ترکوں کو کیوں لپیٹ رہا ہوں گو یہ حق پسندی کے خلاف ہے۔ جو کچھ بھی حسین رؤف بک (سابق کپتان حمیدیہ) اور بہا بک ترکوں کے جیش الاحتلال نے کہا، اس میں خواہ کتنی ہی مبالغہ آمیزی کیوں نہ ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ میں نے ایک متنفس کو انھیں اچھے نام سے یاد کرتے نہیں سنا، ان کے نزدیک جیسا مجھ سے بیان کیا گیا، عرب و ایرانی و کرد کا خون گھوڑے اور خچر کے خون سے بھی کم قیمت رکھتا تھا، ایک کرد نے مجھ سے بیان کیا کہ ایک بیچارہ ایرانی سید درویش کربلائے معلی زیارت کو جا رہا تھا، ترکوں نے جاسوس سمجھ کر گرفتار کر لیا، اور آناً فاناً اس کو قتل گاہ میں لے گئے درویش نے بہا بک سے کہا کیا آپ خدا سے نہیں ڈرتے بہا بک نے کہا اللہ کیم در یعنی اللہ کون ہے غرض مفلوک الحال آبادی کے لیے انگریزوں کی انسانیت یا ڈپلومیسی جو کچھ بھی کہو اس بات پر مجبور ہوئی کہ ان کو خود فوج کے سامان رسد سے حصہ دیا جائے اور اس کی صورت یوں کی گئی کہ فاقہ کش مگر شریف خاتونیں کیمپ کے چاروں طرف ہلکے ہلکے کام پر لگا دی جائیں اور شام کو مزدوری کے عوض ان کو پورا راشن دیا جاتا، اس کا انتظام میرے متعلق تھا اس کام میں مجھے صد درجہ پریشانی اٹھانی پڑتی تھی کیونکہ فوجی سپاہی ان کو چھیڑتے اور اکثر گمراہ کرنے پر بھی کامیاب ہو جاتے اس میں ایک غریب مگر نہایت غیرت مند کردی نوجوان لڑکی تھی جس سے خود مجھ کو محبت ہو گئی اور آخر میں میں نے اس سے شادی کر لی، میری عمر اس وقت اکیس ۲۱ برس سے زیادہ نہ تھی، اور کالج سے نکلے ہوئے مجھے ایک سال بھی نہ ہوا تھا، مجھے اس وقت نہ بتقاضائے سن خانہ آبادی کی اتنی فکر تھی اور نہ ضرورت تھی مگر دل نے بے قابو کر دیا، اس کی علٰحدہ داستان ہے یہاں صرف اتنا کہنا چاہوں کہ ترکوں نے آبادی کو قحط زدہ بنایا تھا اور جب انگریزی دور کی برکات میں انکی روزی مقرر ہوئی تو میرے ہاتھ اتفاقیہ وہ بیش بہا گوہر لگا، جو شاید کسی دوسری صورت سے ممکن نہ ہوتا اس لیے میں ترکوں کی برائی میں بھی اپنے لیے ایک بھلائی پاتا ہوں، میں ان کا پہلے بھی دعا گو تھا اور اب تو اور زیادہ ہوں،

میری یہ متاہل زندگی ۷ رجون ۱۹۱۸ء سے شروع ہوئی اور ۲۶ رنومبر ۱۹۲۱ء کو ہندوستان میں ختم ہو گئی

گویا کہ وہ ایک نہایت شیرین خواب تھا جو مین پھر کبھی نہ دیکھونگا لیکن اس یاد کے ساتھ قصر شیرین کی یاد کبھی کبھی تڑپا دیتی ہے اور یہ مضمون صرف اسی تڑپ کے مٹانے کے لیے حوالۂ قلم ہے۔

میری بیوی متوسط کرد طبقے کی لڑکی تھی مین فارسی اور عربی مین اپنا مطلب تو بے تکلف ادا کر سکتا تھا، اور ترکی بھی وقت کے ساتھ مگر کردی کا ایک لفظ بھی میری سمجھ مین نہ آتا تھا، اسی طرح میری بیوی سوائے کردی کے خود فارسی زبان بھی نہ بول سکتی تھی۔ مگر ذہانت کا یہ حال تھا کہ چند ماہ مین نہایت صاف فارسی اور ٹوٹی پھوٹی ترکی بولنے لگ گئی کردی عورتون کا لباس بالکل اسی وضع کا ہوتا ہے جیسے ہماری طرف بلوچون کا مگر میری بیوی ایرانی اور ترکی لباس بھی پہنتی تھین اور مین نے ان کو ساری اور فراک کا شوق بھی دلایا، پیرون اور ہاتھون مین کوئی زیور نہین ہوتا، سر پر ایک گول ٹوپی اور بعض اوقات ریشمی رومال بندھا رہتا ہے، کانون مین آویزے اور گلے مین گلوبند میری بدعت تھی، اور میری بیوی نے قصر شیرین مین اپنی کا فیشن کر دیا تھا، کردی عورتین جو ٹیلاق[1] کی رہنے والی ہوتی ہین وہ بالعموم نہایت سرخ و سپید و حسین ہوتی ہین مگر ان کا نقشہ سبک نہین ہوتا، بالعموم بلند قد اور قوی و توانا ہوتی ہین جیسے ہمارے یہان کی جاٹنیان۔ میری بیوی بھی ٹیلاقی کردنی پروردہ تھین اور وہی حلیہ ان کا تھا جو ان کی قوم کا تھا، گھوڑے کی سواری اور بندوق کا نشانہ دونون مین مجھ سے زیادہ مشاق تھین اور قد بھی مجھ سے کچھ ہی کم تھا، حالانکہ شادی کے وقت ان کی عمر چودہ برس سے زیادہ نہ تھی۔

قصر شیرین مین مین نے متواتر پانچ ماہ گذارے اگرچہ زیادہ تر مجھے سبزی فروشون اور بیوی بھیکدارون سے سابقہ پڑتا تھا، لیکن خانہ داری کی زندگی شروع ہوتے ہی مین قصر شیرین کی سوسائٹی مین داخل ہو گیا،

دریاے حلوان کے دوسری طرف ایک نہایت فرحت افزا باغ ہے جس کو باغ شاہی کہتے ہین، شاہ ناصر الدین جب کربلاے معلی کی زیارت کو جا رہے تھے تو انھون نے موکب شاہی کی یادگار مین ایک باغ کی بنیاد ڈالی گویا یہ ایک قسم کا پبلک گارڈن ہے اور اس کا انتظام شرفائے قصر شیرین مین سے ایک کے سپرد کر دیا اب یہ اس خاندان کی وراثت ہے اور یہ اپنے لقب باغبان باشی کے نام سے مشہور رہے، موجودہ باغبان باشی ایک نہایت دلچسپ اور حد سے زیادہ موٹے انسان ہین مجھ سے بہت جلد مانوس ہو گئے، مین ان کی دعوت پر ہمیشہ شام کو قاطر پر سوار ہو کر دریا کو پار کر کے باغ شاہی مین جاتا جہان سماوار گرم ہوتا، چائے کا دور چلتا اور لطف و کیف سے زندگی بسر ہوتی مگر افسوس ہے کہ اب ایسے جلسۂ احباب مین تمدن جدید کے طفیل مین بجائے چائے اور قہوہ کے کسی اور چیز کا دور رہتا ہے۔

قصر شیرین مین میرا ایک اور رفیق شاہ مراد نامی دکان دار تھا، کرد کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنی گفتگو مین

---

[1] ٹیلاق انگریزی ہائی لینڈ کا مرادف ہے

دال ہمیشہ گرا دیتے ہیں مثلاً وہ بغداد کو کہیں گے بغا، محمد کو محمہ، احمد کو احہ، مجھے کرد سید احمد کے نام سے جانتے تھے تو میری بیوی اور تمام کرد مجھے سید احمد کی بجائے سیا احہ سے پکارتے اور میں سمجھتا کہ وہ مجھے سیاہ کہہ کر میری تحقیر کرتے ہیں کیونکہ ہندو سیاہ مشہور ہے اگرچہ میں کالا نہ تھا اور میرے ہی رنگ کے قصر شیرین کے اور تمام لوگ تھے، بعد کو معلوم ہوا کہ یہ سید احمد کا بگاڑا ہوا لفظ ہے، خیر تو شاہ مراد کا نام کردوں کی زبان پر ہمیشہ شاما رہتا ہے، پہلے جب شاما کا لفظ میں نے سنا تو مجھے گمان ہوا کہ یہ کسی ہندوستان کا پیارا ہندوانہ نام تو نہیں بعد کو پتہ چلا کہ یہ شاہ مراد کا بگاڑا ہوا لفظ ہے خیر ہمارا رفیق شاہ مراد عرف شاما اپنی زندگی کا خود ایک فلسفہ رکھتا ہے اس میں شک نہیں کہ وہ شراب کا عادی ہے مگر اس کے ساتھ حد درجے کا لاابالی اور زندہ دل ہے موجودہ پالٹکس میں بھی حصہ لیتا ہے اور جب اس سے فرصت پاتا ہے، تو کباب بیچتا ہے مگر یہ کباب بیچنا سوسائٹی میں اس کی وقعت کو کسی طرح کم نہیں کرتا، اپنے کو دیماقرات کہتا ہے جسکے معنی غالبًا اس کے نزدیک زیادہ برین نیست کہ وہ موجودہ سیاست سے کچھ واقف ہے اور اخبار بینی کرتا ہے، میں نے اُسکو قصر شیرین میں بھی ہر اعلیٰ اور ادنیٰ کا دوست و رہبر پایا، اور جب تک میں قصر شیرین میں رہا میرا بڑا ہی ہمدم تھا، وہ میرے گھر میں بے تکلف آتا اور گھنٹوں گذرے ہوئے واقعات، ترکوں کی یلغار، جرمنوں کا تقسیم پول، روسیوں کی قزاقی، مشروطہ اور استبداد کی بڑی دلچسپ داستان سناتا، اسی شاما نے مجھے بہت سی قدیم عمارتوں کا پتہ دیا اور دو تین قدیم سکے یزدجرد کے زمانے کے جو کسانوں کو قصر شیرین کے خرابہ میں ملے تھے مجھے عنایت کیے۔

اپنے دوستوں کی بدولت مجھے کردستان کے قومی ناچ دیکھنے کا بھی موقع ملا، شادی، برات اور جشن کے دنوں میں کردوں کی جوان لڑکیاں جوان مردوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر ایک حلقہ بناتی ہیں، بیچ میں کھڑے ہو کر ایک شخص باجہ بجاتا ہے اور یہ مرد اور عورتوں کا حلقہ اچھلتا ہوا گردش کرتا ہے، مرد اور عورت بالکل غیر محرم ہوتے ہیں۔ عموماً یہودی عورتیں اور کردی مرد اس میں حصہ لیتے ہیں، کردی عورتیں اور یہودی مرد زیادہ تر تماشائی ہوتے ہیں۔ مگر میں نے اکثر سلیمانیہ کے اضلاع میں کردی عورتوں کو بھی یہودی مردوں کے ساتھ رقص کرتے ہوئے دیکھا ہے، اس ناچ کو یہاں پر پھرکا کہتے ہیں، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ ہندی لفظ ہے یعنی ہر پھر کر آنا، اور یہ ناچ در اصل ان خانہ بدوش زنگاریوں نے ایجاد کیا ہے، جو ہندوستان سے گئے تھے، یونانیوں اور بلقانی قوموں کا ناچ بھی ایسا ہی ہوتا ہے، ہر پھرکا ہی کے سلسلہ میں مجھے یہ اندازہ ہوا کہ کردوں کا حسن شامی عورتوں کے بعد سب سے زیادہ دلآویز ہوتا ہے، عورتیں عموماً بلند بالا اور گداز بدن کی ہوتی ہیں، اور اگر ان کی آنکھیں موصل اور دمشق کی عورتوں کی طرح بالکل چمکدار سیاہ ہوا کریں تو وہ ان سے حسن میں بڑھ جائیں، مگر کردی عورتوں کی آنکھیں بالعموم شربتی یا بھوری ہوتی ہیں، رنگ ان کا کشمیریوں کی طرح صباحت لیے ہوئے زیادہ ہوتا ہے، اور شامی عورتوں کی سفید رنگت ملاحت لیے ہوتی ہے، زلفوں کو شانہ کر کے اپنے رخسار کے دونوں طرف ڈالے رہتی ہیں اور یہی طریقہ ایرانی عورتوں کا بھی ہے، چنانچہ اسی لیے شعرائے ایران جب زلف معشوق کا ذکر کرتے ہیں

تو اس کی سیاہی کو رخسار کی سپیدی کے ساتھ ملا کر مقابلہ کرتے ہیں حیرت ہے کہ ہندوستان کا شاعر جہاں عورتیں چوٹیاں گوندھ کر پیچھے ڈال لیتی ہیں وہ کیون زلف اور رخسار کا ساتھ ذکر کرتے ہیں، اسی طرح ایران مین خال کا وہ مفہوم نہیں سمجھا جاتا جو ہندوستان مین ہے خال وہاں تل کو نہین بولتے بلکہ وہ نیلا گودنا ہوتا ہے جو عورتین اپنے رخسارون کے دونون طرف اور ٹھوڑی پر گدواتی ہین، تل کو نشانہ بولتے ہین اور یہ خوبصورتی کے بجاے عیب ہے، کردستان مین جب موسم بہار آتا ہے تو تمام خشک پہاڑیان گل و سبزہ سے دولہن بن جاتی ہین چڑیان چہکنے لگتی ہین، ہوا مین ایک عجیب تازگی پیدا ہوجاتی ہے، ہر چہار طرف سے بلبل کی آوازین آنے لگتی ہین اس وقت ایرانی شاعر گل و بلبل اور بہار کی تعریف مین رطب اللسان ہوتا ہے، ہندوستان مین موسم بہار نہین آتا مگر یہان کے اردو شعرا بلبل اور گل و بہار کی تعریف اس طرح کرتے ہیں، گویا خود یہ ان کے ملک کی چیز ہے، اردو کے شعرا واقعی اگر کسی چیز کی تعریف کرسکتے ہین تو وہ، ساون بھادون کا موسم ہے،

ایرانی زبان مین کُرد کے معنی دیہاتی کے ہین اور یہ غالباً ایرانی زبان کی خصوصیت ہے کہ اس مین بعض قومون کی صفات کو اس قدر ضرب المثل کر دیا ہے کہ اس کے معنی اب لغوی ہوگئے مثلاً قزاق ایک تاتاری قوم ہے اور فارسی مین ڈاکو، اسی طرح پارسا، پہلوان، لُور، ہندو، قوچی، تاتار، تازی، تُرک یہ سب قومون کے نام تھے اب ان کے معنی نیک بخت، طاقت ور، بے وقوف، کالا غلام، خدمتگار، نامہ بر، بھگوڑا اور معشوق کے آتے ہین۔

کردون مین بہت سے الفاظ ایسے ہین جو عجیب طرح سے ہندی الفاظ سے مشابہت رکھتے ہین مثلاً پیا د کے معنی مرد کے ہین اور ہندی مین بھی پیا عاشق مرد کے لیے آتا ہے، جاجم کے معنی چادر، شامہ کے معنی کالا لیسے ہی ہندی کا ہے جو کردی مین ہیا ہے لڑکی کو کنشا کہتے ہین جو کنیا کی بگڑی ہوئی صورت ہے

مین نے قصر شیرین کا محرم دیکھا، باغبان باشی اس کے سرغنہ ہین یہان مین نے تعزیہ نہین دیکھا، دُلدل کا رواج ہے جس پر ایک سُرخ چادر پڑی ہوتی ہے اور اس کے ارد گرد ننگے جسم، ننگے سر ننگے پیر اور زلف پریشان عورتون کا غول ہوتا ہے، ایک اپنا منھ نوچ کر لہولہان کرتی ہے اور دوسری اپنی چھاتی پیٹ پیٹ کر، بعض خواتین خنجر اور زنجیر سے اپنے سینے کو زخمی کرتی ہین۔ ماتم والون کے ساتھ ایک سرکاری گارڈ رہتا ہے تاکہ کوئی شخص اپنے کو مہلک ضرب نہ لگائے۔ اکثر ایسے حادثات ہوچکے ہین۔ بہرحال محرم مین کوئی خاص بات نہ تھی اور نہ مجھے اُس پر زیادہ روشنی ڈالنے کی حاجت ہے۔

قیام قصر شیرین مین مجھے اکثر مضافات کے گاؤن بھی دیکھنے کا موقع ملا، قصر شیرین کے جنوب مین دس میل دور ایک زرخیز خطہ گیلان کا ہے، یہ وہی گیلان ہے جہان شیخ عبدالقادر گیلانی پیدا ہوے تھے، کیخسرو کہا کرتا تھا کہ میری مملکت مین ایک منزل پر برف پڑتی ہے اور دوسری منزل پر باد سموم چلتی ہے جو شخص ایران مین رہا ہے وہ یقیناً

اس قول کی تائید کرے گا، مین نے کہین بھی اتنے کم فاصلے پر ٹمپریچر کا ایسا اختلاف نہین دیکھا، قصر شیرین کا خطہ بلند پہاڑون کے دامن مین واقع ہے اور یہ حصہ ایران کا گرم سیر کہلاتا ہے، جہان بقول میری بیوی کے "ہوائے قصر شیرین آدم را کورمی کند" گرمی بھر بخار اور آشوب چشم مین آبادی مبتلا رہتی ہے، پائے طاق قصر شیرین سے مغرب کی جانب اندرون ایران کوئی بیس پچیس میل دور ہے، یہ مقام ایک بلند پہاڑ کے دامن مین واقع ہے، اس بیس میل کے اندر قصر شیرین اور پائے طاق کی آب و ہوا کا وہی تناسب ہے جو شملہ اور دہلی کی آب و ہوا مین ہے، جب مین قصر شیرین سے گرمی مین جل کر یہان آیا تو اختلاف ہوا سے میرے ہونٹھ پھٹ گئے، جیسا شروع جاڑے مین اکثر ہندوستان مین ہوجاتا ہی سرپل ایک گاؤن ہے جو پائے طاق اور قصر شیرین کے ایک نہایت شاداب میدان مین واقع ہے اور یہ سب مقامات قصر شیرین، کرند، کرمانشاہان کی شاہ راہ پر واقع ہین، سرپل کے شمالی جانب زہاب کا زرخیز میدان واقع ہے جو مغربی ایران مین سب سے زیادہ زرخیز خطہ سمجھا جاتا ہے، لوگ کہتے ہین کہ یہ زر آب کا بگاڑا ہوا ہے، یہان کی سب سے بڑی کاشت مکا ہے جس کو یہان ذرات بولتے ہین، یہ یہان کی سب سے بڑی غذا ہے

سرپل کا میدان اور زہاب کا میدان دریائے حلوان اور ایک چھوٹی پہاڑی سے جو بالکل دریائے حلوان کے متوازی چلی گئی ہے جدا ہو جاتا ہے، سرپل کو سرپل زہاب بھی کہتے ہین اور غالبا سرپل کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ یہان دریائے حلوان پر ایک پرانا پتھر کا پل بنا ہوا ہے، پہاڑی کا سلسلہ تین حصون مین تقسیم ہے، پہلے حصے کا شمالی رُخ قدیم ایران نقوش و تصاویر سے مزین ہے ہر سلسلے کے آخر مین ایک گاؤن ہے، ایک گاؤن کا نام میان گل ہے یہان کردون کا ایک قبیلہ ناچ گانے کا کام کرتا ہے اور ہمارے یہان کے نٹ سے مشابہت رکھتا ہے، ہمارے فوجیو نکی تفرج گاہ یہی گاؤن ہے، اکثر مجھے اڈجوٹنٹ اور کرنیل کی تلاش مین شام کو یہان آنا پڑتا تھا، پائے طاق اور سرپل کے کرد عموماً علی اللہی ہین جو نصیریون کا سا عقیدہ رکھتے ہین۔ اور میرے نزدیک کسی حیثیت سے مسلمانون کی جماعت مین داخل نہین کیے جا سکتے سور کا گوشت ان کے نزدیک ہر بیماری کی دوا ہے، طہارت اور نماز نہین جانتے داڑھی رکھنا سخت معیوب جانتے ہین، سال مین ایک روزہ رکھتے ہین، بجائے لاالہ الااللہ کے ان کا کلمہ جو وہ صبح و شام پڑھا کرتے ہین، اول و آخر علی غالب ہے، غرض کہ جو کچھ ان کا خدا، پیغمبر، رسول، امام ہے وہ علی کی ذات ہے، اس فرقہ کا سب سے بڑا مرکز کرند ہے، علی اللہی عباس اور داؤد کو بھی اپنا پیشوا جانتے ہین، ایران مین جب تم کسی ایرانی کو بات کرتے ہوئے سنو گے تو ممکن نہین کہ وہ دوران گفتگو مین ابوالفضل عباس کے سر کی قسم نہ کھائے، اور علی اللہی کردون مین یا عباس ایسا ہی تکیہ کلام ہے جیسا سنی کردون مین یا غوث! ابوالفضل عباس غالبًا حضرت عباس عم رسول کی کنیت تھی اور آل عباس کو شیعہ نہین مانتے مگر شاید یہ یادگار ہے عباسیون کے وقت کی کہ ان کو اپنے آباؤ اجدا د خصوصًا ابن عباس کے نام کو روشن کرنے کی بڑی آرزو تھی،

ایک علی اللہی نے اپنے عقیدے کے متعلق مجھ سے ایک عجیب روایت بیان کی کہنے لگا کہ حضرت علی جب ایران تشریف لائے تو ایک بڑھیا کے یہان ٹھہرے، اس کا ایک لڑکا تھا وہ حضرت علی کی کرامتین دیکھ کر اُنھین کو خدا کہنے لگا، حضرت علی نے اس کو غصے مین قتل کر دیا مگر بڑھیا کی آہ و بکا سے حضرت علی کو رحم آیا اور اُنھون نے اُس لڑکے کو از سرِ نو زندہ کر دیا، جب وہ زندہ ہو گیا تو وہ حضرت کی خدائی کا اور زیادہ معتقد ہو گیا حضرت علی نے غصے مین پھر اس کو قتل کر دیا اور اس طرح کئی بار قتل کیا اور جلایا، آخر کار تھک گئے اور اس لڑکے کو اپنے حال پر چھوڑ دیا، اس لڑکے کی اولاد سے علی اللہی پیدا ہوئے اور چونکہ حضرت علی نے اس لڑکے کو بشارت دی تھی کہ تیری نسل خوب چلے گی اور وہ میری خدائی کا اقرار کر یگی اپنے کو کسی دوسرے خدا کا بندہ مت کہلانا، داؤد کے متعلق مجھے معلوم نہ ہوا کہ یہ کون بزرگ ہین۔ نبی داؤد سے بظاہر کوئی دور کا تعلق بھی ان کردون کو نہین ہے غالباً یہ کسی باطنی فدائی داعی کا لقب ہے جس کو ان احمقون نے یاد کر لیا ہے، خلاصہ یہ کہ ایران کے اندر یہ فرقہ اس زمانے کی یادہے جبکہ منافقین، مجوس، زنادقہ، و باطنیہ فرقون مین ظاہر ہو کر فتنے کے سبب ہوے ہین

میدان زباب کے رہنے والے کرد سُنّی عقیدے کے ہین اور سرپل کے باشندے بھی سُنّی ہین ان کے رئیس شہباز خان سے ملا ہون، آدمی نہایت سنجیدہ و خاموش ہین، اور برخلاف اپنی قوم کے نہایت دُبلے پتلے حقیر و لاغر شخص ہین ان کی بیوی گوہر خانم ایک علی اللہی سردار قادر سلطان کی بہن ہے جو نہایت بذلہ سنج، تعلیم یافتہ اور شاعرہ خاتون ہے اور اس کے ساتھ حسن خداداد ایسا ہے کہ جنھون نے خانم موصوف سے ملاقات کی ہے (اور وہ کسی سے پردہ نہیں کرتین) ان کو ضرور ملاقات کے ختم ہونے کا افسوس ہوا ہو گا، مین شہباز خان کے پاس اپنے قیام سرپل مین کئی بار گیا اُنھون نے میری ملاقات اپنے سالے سے کرائی اور ان دونون نے جو فارسی بہت صاف بولتے ہین میری بڑی حرمت و عزت افزائی کی۔

سرپل سے کوئی پانچ میل اُتر کی طرف ایک بلند پہاڑی پر ایک شکستہ قلعہ ہے جو قلعۂ یزدگرد کے نام سے مشہور ہے، اس کے قریب ایک قدیم کہنہ مسجد ہے جو مسجد بابا یادگار کہلاتی ہے، کہتے ہین کہ یہ مسجد حضرت سعد فاتح ایران نے بنوائی ہے، اس کے چارون طرف انجیر کا بہت بڑا جنگل ہے اور ان پہاڑیون سے بہترین شہد نکلتا ہے، پہاڑ دفعۃً زمین سے اونچا ہو گیا ہے اور پہاڑ کے اوپر پہنچنا مشکل ہے میرے ساتھ اصفہان کا ایک درویش سفید کلاہ پہنے ہوے ساتھ تھا، جو کربلا جا رہا تھا، بڑا دلچسپ قصہ گو تھا اور اپنی گذر اوقات اخروٹ بیچ کر کیا کرتا تھا،

میرا کیمپ بالکل دریائے حلوان کے ساحل پر کرمانشاہان بغداد کے شاہراہ پر تھا، اور قیام سرپل مین مجھے ایران کے بہت بڑے لوگون کی مہربانی کا فخر حاصل ہوا ہے، اس مین نصرت الممالک گورنر کرمانشاہان، اخوند کرمانشاہان اور وزیر خارجیہ ایران بھی تھے، جنھون نے میرے ساتھ کربلا جاتے ہوے چائے پی اور ایک تبریزی

ایرانی خاتون دلبر خانم جو تنہا کربلا جا رہی تھین اپنے خادم کے ساتھ میرے یہان شب باش ہوئین، جب وہ رخصت ہو گئیں تو معلوم ہوا کہ وہ روس کی ایک مفرور ارمنی عورت تھی جس کا نام مریم میگرڈشین تھا اور سویٹ روس کی جاسوس تھی ان سے پھر میری ملاقات بغداد مین ہوئی جہان وہ نرس کا کام کر رہی تھین اور جب مین نے ان سے کربلا کی زیارت کا حال دریافت کیا تو مسکرائین اور اپنے حیرت ناک راز بتائے وہ میرے ہمراہ باکو روس تک آئین اور اس کے بعد پتہ نہ چلا کہ ان کو زمین کھا گئی یا آسمان،

پائے طاق کی بلند پہاڑیون پر چھوٹے چھوٹے بلوط کے درختون کا جنگل ہے اور اس سے متعدد چشمے بہ بہ کر میدان سرپل کو سیراب کرتے ہین، یہ میدان جو تقریباً دس یا بارہ میل کے رقبے کا ہے یکسر قابل زراعت ہے مگر کہین ایک درخت کا بھی پتہ نہین۔ جنوب کی طرف وہی بابا یادگار والی پہاڑی ہے اور اسی کے جوار مین ایک گاؤن رجاب ہے جس مین کثرت سے میوے دار درخت خصوصاً انجیر وہین کے پائے جاتے ہین۔

سرپل، پائے طاق مین جو خانہ بدوش کردی عشائر رہتے ہین ان مین عشیرت گلخانی بابا یادگار کے میدان مین اکثر سردی بسر کرتی ہے، دوسری عشیرت کلہور ہے جو حلوان کے دوسرے جانب میدان مین تمام سال رہتی ہے، کلہور کے قبیلے مین شیعہ سُنّی دونون مذہب کے لوگ ہین مگر یہ لوگ گلخانیون کی طرح لٹیرے نہین، گلخانی قبیلہ علی اللہی عقیدہ رکھتا ہے وہ بڑا سفاک اور غارت گر قبیلہ ہے اور ان کے راستے سے کوئی حاجی، سپاہی یا مسافر بچ کر نہین جا سکتا، کلہور عموماً گلہ بانی کرتے ہین۔ اور امن سے رہتے ہین، تیسرا قبیلہ سنجابیون کا ہے جو بالکل شیعہ ہین اس قبیلے کا سردار اکبر خان ترکون کی حمایت کی وجہ سے انگریزون کا دشمن سمجھا جاتا تھا اور میرے زمانے مین اکبر خان ترکون کے ساتھ مل کر لڑ رہا تھا اور انگریزی طیارے اس قبیلے کو گھیر گھیر کر بم سے تباہ کر رہے تھے زہاب کے سنی کردون کا سرگروہ ایک شخص مصطفیٰ پاشا باجلال تھا جو ایک وقت مین ترکون کی طرف سے بغداد کا قائم مقام رہ چکا تھا، چونکہ مٹی کے تیل کی زمین اسی قبیلے کی حدود مین زیادہ تر واقع ہے اس لیے انگریز عبد الحمید خان کے زمانے سے اس کو پرچا رہے تھے اور اس جنگ مین ترکون کے خلاف انگریزون کی مدد اسی قبیلے نے سب سے زیادہ کی ہے، انگریزون کی طرف سے ایک شخص میجر سون جو جنگ کے پہلے اینگلو پرشین ائل کمپنی مین ملازم تھا، اور جو کردی مادری زبان کی طرح بولتا تھا اس قبیلے کا حاکم سیاسی مقرر کیا گیا، یہ کبھی مسلمان ہو جاتا اور کبھی ایرانی اور کبھی کچھ اپنا نام غلام حسین رکھ لیتا اسنے ایک ایرانی عورت سے شادی یا متعہ کر لیا تھا حد درجہ سنگ دل اور ظالم شخص تھا

میجر سون کے ماتحت مین بھی رہا ہون بلکہ کردی زبان میں میرا امتحان اسی نے لیا تھا، یہ شخص ولایت جا کر مر گیا کئی کتابون کا مصنف ہے، مصطفیٰ پاشا باجلال اب انگریزون سے وظیفہ پاتا ہے ایک بڈھا کانا شخص ہے، اور

بغداد آتے ہوے میری اوراس کی لڑائی بھی ہوگئی، مین نے اس کے ایک طمانچہ رسید کیا اور بعد کو مجھے معذرت مانگنی پڑی۔

سرپل مین روسیون کے آنے سے قبل ایک ایرانی تارگھر اور ایک چاپار خانہ (پوسٹ آفس) اور ایک قورخانہ (میگزین) تھا، اب سب تباہ ہوگئے ایک بہت بڑی سرائے شاہ عباسی کے نام سے مشہور ہے، میرے کیمپ کے مقابل واقع ہے اس مین مسافر اور زائرین کے لیے پختہ مکانات بنے ہین، یہان ضرورت کی سب چیزین مل جاتی ہین مگر روس کی تباہی کے بعد اب ویرانہ ہے،

سرپل مین چند ایرانی عملے ٹیکس وصول کرنے پر مامور ہین مگر مجھے معلوم نہوا کہ ان کی مالیت کس کی جیب مین جاتی ہے، پولیٹکل افسر قصر شیرین کا عموماً ان عملون کی نگرانی کرتا ہے، سب سے بڑا ٹیکس جو سرپل مین وصول ہوتا ہے وہ پول چارواداری ہے جو کاروانون سے بحساب فی قران فی قاطر (خچر) اور دو قران فی شتر وصول کیا جاتا ہے اس روپے سے کسی قسم کی سڑک وغیرہ تیار نہین کی جاتی اور ایرانی عملون نے مجھ سے بتایا کہ چونکہ زہاب کی زمین شاہی املاک سے ہے اس لیے کاروان کے جانور جو سبزہ چرتے ہین یہ ٹیکس اس کی اُجرت ہے مامورین اس کے ساتھ اپنا حق بھی وصول کرتے ہین اور اس کو پول بنہ کہتے ہین جیسے ہمارے ہندوستان کے تحصیل کے عملے کرتے ہین صرف اتنا فرق ہے کہ یہان خوشامد سے لیتے ہین اور وہان سینہ زوری سے مین نے اکثر راتون کو عرب کاروانجی کو واویلا کرتے ہوے سُنا معلوم ہوا کہ مرزا اپنا پول بنہ وصول کررہا ہے مرزا مرتضیٰ خان رئیس مالیہ ایک نوجوان ایرانی ہین، فرانسیسی جانتے ہین، شراب پیتے ہین، پاتلون پہنتے ہین اور سرپل کی لڑکیون سے وقتی نکاح کیا کرتے ہین۔

ابن السبیل

نگار مفت دیکھیے

جس کی تدبیر یہ ہے کہ پانچ رُوپے نئے خریدار کا چندہ بھیج کر صرف حسب ذیل کتابین ہم سے مفت لیجیے

تذکرہ خندۂ گل ۱؎ سائنس کے عجائب چار آنہ ۴؎ جذبات بھاشا ۱۲؎

رجسٹری کے مصارف آپ کے ذمے ہون گے

مینیجر نگار لکھنؤ

لسانیات کے اصولِ اولین - لغت و زبان کا معیارِ صحت

اور

ہندوستانی اکیڈمی کے دو لفظ تماہی اور ہندستانی

جس وقت سے صوبۂ متحدہ، کا سرکاری دارالادب ہندوستانی اکیڈمی عالم وجود مین آیا ہی، اسی وقت سے اہلِ ملک اس کی طرف متوجہ معلوم ہوتے تھے لیکن جب سے اس دارالادب نے ایک تماہی آرگن ہندستانی کا اجرا کیا ہے اس وقت سے لوگون کو زیادہ توجہ ہوگئی ہے۔

اس رسالے کا نام بجاے ہندوستانی کے ہندستانی رکھنا اور اس کے موقت ہونے کی تفسیر بجاے سہ ماہی کے تماہی سے کرنا اس پر ملک مین دو رائین موافق و مخالف نظر آتی ہین، آج کی صحبت مین ہم بھی اس مسئلہ پر غور کرنا چاہتے ہین لیکن اس مسئلے مین سب سے پہلے ہم کو وضع لغت و زبان پر اصولی گفتگو کرنے کی ضرورت ہے تاکہ بعد کو یہ مسئلہ از خود حل ہو جائے۔

وضعِ لغت و زبان "ہراسی" مشہور ادیب نے اپنی مستند کتاب "تعلیق" مین لکھا ہے کہ

> وضع لغت کی ضرورت اس لیے ہوئی کہ انسان کا تمدن اور تعاون باہمی قائم ہو، انسان چونکہ مدنی الطبع ہے اس لیے اس کو تعاون کی ضرورت ہے جو زبان سے قائم ہوتا ہے

اس کی تشریح ان الفاظ مین کی ہے:۔

> انسان چونکہ طلب معاش و معاشرت مین تنہا کامیاب نہین ہو سکتا بلکہ اس کو دوسرون کی حاجت ہوتی ہے اس لیے اس نے شہر یا قصبہ وغیرہ مین رہنا ضروری خیال کیا تاکہ امورِ معاش و معیشت مین ایک دوسرے کی اعانت حاصل ہو سکے اس اعانت اور طلبِ مدد کے لیے کسی چیز کا مشترک ہونا ضروری تھا

اور وہ چیز زبان تھی جس کے ذریعے سے اظہار خیال اور طلب مدد کا مقصد پورا ہوتا ہے
دوسرا قول امام سیوطی نے مزہر مین یہ نقل کیا ہے۔
انسان چونکہ مدنی الطبع واقع ہوا ہے اس لیے اس کو صنائع وغیرہ کی ضرورت ہوئی، ایک انسان اپنی تمام ضرورتین مہیا نہین کر سکتا اس لیے دو حالتون مین سے ایک کا ہونا ضروری ہے، یا تو اس کی حاجت اور مقصد کی چیز اس کے سامنے موجود ہوگی یا موجود نہ ہوگی، موجود ہوگی تو اسکے حصول یا طلب کے لیے اشارون کی ضرورت ہوگی، موجود نہ ہوگی تو اس کا طلب کرنا ضروری ہوگا اس طلب اور استحصال کے لیے کلام کی ضرورت ہوگی کلام حروف اور آواز کا مجموعہ ہوتا ہے آواز کے تابع حروف ہوتے ہین آواز کا مخرج لب، زبان تالو اور حلق ہوتے ہین اسلیے جو حروف وضع کئے گئے انھین مخارج کے اعتبار سے اور ان کی تعداد انتیس [29] ہے۔
چونکہ مفرد حروف سے تکملہ طلب مدعا کا نہین ہوتا تھا اس لیے ان سے دو حرفی، سہ حرفی، چہار حرفی، پنج حرفی الفاظ بنائے گئے یہی مجموعۂ حروف کلمہ اصلی قرار دیا گیا جو پانچ حرف سے زیادہ نہین ہوتا البتہ خاص مواقع پر اس مین اضافہ کر دیا جاتا ہے، پھر الفاظ اور کلمات کیلیے معانی مقرر کیے گئے، اس کی دو صورتین قرار دی گئین۔

اول الفاظ متوارد

دوم مترادف

الفاظ مترادف وہ قرار دیے گئے، جو ایک ہی معنی کے لیے استعمال ہوتے ہین۔ مثلاً شیر کے لیے غضنفر، اسد، لیث حارث واہاث وغیرہ کہ ان سب کا مفہوم ایک ہی ہے۔
متوارد وہ قرار دیے گئے کہ ایک لفظ کے کئی معنی ہون مثلاً عین کے معنی آنکھ، چشمہ، سونا وغیرہ
پروفیسر ڈبلو، ڈی ہوٹنی ماہر لسانیات کا قول بھی انھین اقوال کا خاکہ ہے وہ لکھتے ہین کہ:۔
لسانیات کا مواد اور موضوع زبان من حیث المجموع ہے یعنی نطق انسانی (Human Speech) کی تمام اقسام مع اپنے کثیر التعداد اختلافات کے (لسان و مطالعہ لسان ص [6])
وضع لفظ و معنے۔ تاج سبکی کا قول شرح منہاج البیضاوی مین یہ ہے کہ:۔
وضع نام ہے کسی شے کو کسی شے کے ساتھ اس طرح خاص کرنے کا کہ جب ایک بولی جائے تو دوسری بھی سمجھ مین آجائے، مثلاً کہا جائے کہ "زید کھڑا ہوا" اس سے صدور قیام سمجھ مین آگیا
بعض اہل لغت کا اس مین اختلاف ہے کہ واضع نے الفاظ کو مفردات اور مرکبات کے لیے وضع کیا ہے یا صرف

مفردات کے لیے
امام رازی ابن حاجب اور ابن مالک کی راے ہے کہ صرف مفردات کے لیے کیونکہ مرکب بالذات کوئی مستقل شے نہین اِس کی ضرورت جملون کے استعمال اور نقل کے لیے ہوتی ہے
قرافی اور تاج سبکی دوسری شق کی تائید کرتے ہین ان کی راے مین مفردات اور مرکبات دونون دوش بدوش ایک حیثیت رکھتے ہین،
ابن ایاز شرح فصول مین لکھتے ہین کہ:-
کلام لفظ مرکب مفید وضع کا نام ہے -
شیخ سعدالدین کا قول ہے کہ واضع لغت نے مفردات کی طرح جملون کو وضع نہین کیا ہے بلکہ ان کو متکلم کے اختیار مین چھوڑ دیا ہے
امام فخرالدین رازی کہتے ہین کہ یہ ضروری نہین کہ ہر لفظ کے معنی ہون وہ یہ بھی کہتے ہین کہ معانی غیر متناہی ہوتے ہین اور الفاظ متناہی کیونکہ مرکب ہوتے ہین حروف سے، جو چیز متناہی ہوتی ہے وہ غیر متناہی کو محیط نہین ہوسکتی۔ ورنہ تناہی مدلولات لازم آجائے،
ایک قول یہ بھی ہے کہ وضع لفظ سے معانی مفردہ مقصود نہین ہوتے بلکہ ان سے مرکبات مقصود ہوتے ہین -
بعض ائمہ لغت کہتے ہین کہ
الفاظ اس لیے وضع کیے گئے ہین کہ ان کے ذریعے سے صورت ذہنیہ سمجھ مین آئے یعنی وہ صورت جس کا تصور واضع نے اپنی ذہن مین وضع کے وقت کیا ہے
بعض کی راے ہے کہ اُن سے ماہیات خارجی مقصود ہوتے ہین، شیخ ابواسحق شیرازی اس راے کی تائید کرتے ہین، امام رازی اولی شق کے موافق ہین
اس پر یہ دلیل قائم کرتے ہین کہ:
الفاظ کا تغیر صورتِ ذہنی کے تغیر کے ساتھ ہوتا ہے مثلاً دور سے کسی شخص نے ایک چیز دیکھی اُسکو اس نے پتھر سمجھا اس نے اس کا نام پتھر رکھ دیا اور قریب سے دیکھا تو اس کو درخت معلوم ہوا، اس نے اس کا نام درخت رکھ دیا اور قریب سے دیکھا تو اس کو گھوڑا معلوم ہوا، اس نے اس کو گھوڑا کہہ دیا اور قریب آیا تو معلوم ہوا کہ انسان ہے اس نے انسان کہدیا اس سے معلوم ہوا کہ الفاظ معانی ذہنیہ کے تابع ہین اور الفاظ معانی ذہنیہ کے لیے وضع کیے گئے ہین، خارجی کے لیے نہین -

صاحب تحقیق کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ "خارج مین جو صورتین ہوتی ہین ان کے اعتبار سے ذہن متاثر اور متشکل ہے نہ یہ کہ ذہن خود متاثر اور متشکل ہوتا ہے۔

عباد بن سلیمان صیمری معتزلی کی راے ہے کہ ہر لفظ اور اس کے مدلول کے درمیان مناسبت طبیعی ہوتی ہے جو واضع کو وضع لفظ پر مجبور کرتی ہے۔

امام عضدالدین کہتے ہین کہ لفظ کبھی شخص خاص کے لیے وضع کیا جاتا ہے اور کبھی اس کے لیے اس طرح وضع کیا جاتا ہے کہ اس سے امر عام کا اعتبار سمجھا جاتا ہے۔

اس بحث کے ذیل مین چند ضروری مسائل آتے ہین

۱۔ ابن جنّی مشہور امام لغت کا قول ہے کہ تمام لغات ایک وقت مین نہین بنتے بلکہ حسب ضرورت بنتے رہتے ہین۔

۲۔ امام رازی کا قول ہے کہ لغت معلوم کرنے کے دو ذریعے ہوتے ہین، ایک صرف نقل دوسرا استنباط عقل۔

معنی کی بھی دو صورتین ہوتی ہین، تواتر، احاد، اس کی بحث آیندہ آتی ہے۔

۳۔ لغت کا علم قیاس سے ہوتا ہے؟ یا اس مین قیاس کو دخل نہین۔

ہر اسی کی راے ہے کہ لغت مین قیاس کو دخل نہین بلکہ اس کا انحصار روایت پر ہے یہی راے اکثر اصولیون کی ہے اکثر فقہاے لغت کہتے ہین کہ لغت مین قیاس کو بھی دخل ہے لیکن قیاس اور راے کس کی قابل سند ہے، اسکا بیان آگے آتا ہے۔

افراد لغت اس فصل مین یہ بتانا ہے کہ اگر ایک شخص ایک لغت بیان کرتا ہے اور اس کو استعمال کرتا ہے تو اُس کا استعمال دوسرون کے لیے مفید ہو سکتا ہے یا نہین؟

امام سیوطی مزہر مین لکھتے ہین کہ اگر یہ شخص تحقیق اور فضیلت، اصابت راے رکھتا ہے تو اسکا قول قابل قبول ہو گا اس کی حسب ذیل مثالین ہین۔

۱۔ ابوزید نے بداوۃ (بادیہ مین رہنا) ب کے فتحہ سے کہا۔ ان کے پہلے بداوۃ فتح سے استعمال نہین ہوا

۲۔ خلیل نے رت اور اس کی جمع رتوت استعمال کی اس کے معنی سور کے زبچے کے ہین۔ خلیل سے پہلے کسی نے نہین کہا تھا۔

۳۔ یونس بن حبیب نے حنیت کو صندید کے معنی مین کہا ہے

۴۔ ابن انباری نے بازلہ کی جگہ بارلہ کہا

۵- ابو مالک کی تنہا روایت ہے کہ انھون نے بر یک "مبارک" کے معنی مین سنا ہے -
۶- انھین ابو مالک کی تنہا روایت ہے کہ انھون نے چھنگلیا اور اس سے ملی ہوئی انگلی کے درمیانی حصے کا نام "بصم" سنا ہے

اردو مین بھی افراد لغت کی حسب ذیل مثالین موجود ہین -
۱- شہنشاہ اکبر نے گھوڑے کے ایک رنگ کا نام سُرنگ رکھا اور وہ رائج ہوگیا ،
۲- اسی نے گھوڑے کی اندھیری کا نام اجیالی رکھا اجیالی کو تمام لوگ استعمال کرنے لگے
۳- بھنگی کو اسی بادشاہ نے حلال خور کہا جواب بھی رائج ہے -
۴- جہانگیر بادشاہ نے شراب کو رام رنگی کہا یہ لغت مشہور ہوگیا یہان تک کہ شعرا نے اپنے اشعار مین لیا طالب آملی کا شعر ہے -

نہ ایم منکرِ صہبا و نیک می گوئیم کہ رام رنگی ما نشۂ دگر دارد

۵- محمد شاہ نے سنگترہ کو رنگترہ کہا ،
۶- بلبل ہندوستان کو گلدُم کہا ،
۷- ہار کو "پھلمال" کہا ،
۸- شاہ عالم نے سرخاب کو گلسرہ کہا لیکن اس لفظ نے رواج نہ پایا شاید اس لیے کہ شاہ عالم کی حکومت کا انحطاط شروع ہوگیا تھا ،
۹- نواب سعادت علی خان نے ملائی کا نام بالائی رکھا، اس نے رواج پالیا -

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان کی تدریج مین حکومت کے اختیارات اور اثرات کو بھی بہت کچھ دخل ہے ان الفاظ کی تفصیل آب حیات کے صفحہ ۴۰ و ۴۱ مین موجود ہے، اسی طرح اور بہت الفاظ ہین جنکی تفصیل ضروری نہین -

اس سے یہ معلوم ہوگیا کہ ایک شخص خلاف قیاس در روایت بھی ایک لفظ یا الفاظ بول سکتا ہے - لیکن یہ بحث طلب ہے کہ اس مین کیا خصوصیات اور اوصاف ہونے چاہیین - اس کا اجمالی بیان ہو چکا ہے تفصیل آگے آتی ہے ،

کس کی روایت قابل قبول ہے؟ قبول لغت کے لیے حسب ذیل اشخاص کو آئمہ لغت نے تسلیم کیا ہے

۱- ابن فارس نے فقہ اللغت مین لکھا ہے کہ :-
راوی لغت اگر ثقہ، صادق القول، امین اور گمان سے بری ہے اور کوئی لغت اس طرح بیان کرتا ہو کہ

اس نے فلان شخص سے سنا ہے تو اس کو قبول کر لینا چاہیے
یہ شرطین اس لیے لگائی گئی ہین کہ اکثر اشخاص کلام غیر عرب کو کلام عرب سمجھ لیتے ہین یا یہ کہ اپنی رائے سے اضافہ کرنا چاہتے ہین حالانکہ یہ دونون صورتین پاکیزگی لغت کے منافی ہین
کمال بن انباری نے لمع الادلہ مین لکھا ہے کہ ناقل لغت کو عادل ہونا چاہیے خواہ مرد ہو یا عورت، غلام ہو یا آزاد، نقل و روایت حدیث کے لیے بھی یہی شرط ہے اگر فاسق اور غیر محتاط ہوگا تو اس کی روایت لغت بھی قبول نہ کی جائے گی۔
احتیاط کی شرط اسلیے لگائی گئی ہے کہ ایسا شخص نہ ہو کہ نقل لغت مین اسکی ذاتی غرض شامل ہو۔
میکسملر (Max Muller) نے اسی موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ قریب قریب انھین اقوال کی تشریح ہے وہ لکھتا ہے کہ:-
اگرچہ زبان مین ہمیشہ تغیرات ہوتے رہتے ہین لیکن ان کا ہونا نہونا آدمی کے بس کی بات نہین، تو ہین زبان کے بدلنے یا اپنی مرضی کے موافق الفاظ تراشنے کا خیال ایسا ہی ہے جیسا اپنے قد کی لمبائی مین ایک انچ اضافہ کرنے کا خیال۔
ٹبریس (Tiberius) شہنشاہ رومتہ الکبرے اور سگسمنڈ (Sigismund) شاہ جرمنی نے لاطینی بولنے مین غلطیان کین اس پر معمولی درجہ کے ماہرین زبان نے کہا کہ خداوندنعمت کے جبروت جلال کی رسائی لاطینی زبان تک نہین۔
پروفیسر ڈبلو۔ ڈی ہوٹنی ایک جگہ لکھتے ہین کہ:-

> قوم، زبان کے بہت ہی ضروری اور عزیز حصہ یعنے الفاظ اور مرکبات ناقص کے بارے مین ان لوگون کو کسی قدر اختیارات عطا کرتی ہے جو اس کے اہل ہوتے ہین

ایک جگہ اپنی رائے کا اس طرح اظہار کیا ہے،

> وہ قوم جو کوئی زبان بولتی ہے ایک جمہوریہ (Republic) یا عمومیہ (Democracy) جس کے اختیارات کا منبع عوام کی رضامندی اور وجہ موجہ ہین

پروفیسر موصوف ایک جگہ لکھتے ہین کہ یہ ہو سکتا ہے کہ عوام کوئی لفظ اختیار کر لین پھر وہ رائج ہو جائے۔ مثلاً ساحل مساچٹ پر پہلا اسکونر طیار ہو کر تختون سے اتارا گیا اور پانی مین ڈالا گیا تو ایک شخص نے متحیر ہو کر کہا (Oh! How She Schoons) اس کے موجد نے یہ سن کر کہا! اچھا! اس کا نام (Schooner) ہی ٹھیک ہے۔ پروفیسر مذکور انحطاط زبان کا سبب لکھتے ہوا اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ مین کرتے ہین

انحطاط ناقص روایت لسان کا نتیجہ ہوتا ہے تحصیل الفاظ مین بے پروائی برتنے یاان کے ہولنے مین غلطی کرنے سے لوگ نسلاً بعد نسل زبان کو مسخ کرتے رہتے ہین -

۲- ابن انباری کا قول ہے کہ عدل واحد کا قول نقل لغت مین قابل قبول ہوتا ہے چاہے اس کے موافقین مین کوئی دوسرا شخص شہادت پیش کرے یا نہ کرے اس پر دلیل قائم کرتے ہوے لکھتا ہے یہ نقل یا تو غلبۂ ظن کے درجے ہو گی یا حصول علم کے لیے ؟ اگر حصول علم کے لیے ہے تو دو یا تین کی شرط فضول ہے ، اگر غلبۂ ظن کے لیے ہے تو دو یا تین شخصون کی موافقت کچھ مفید نہین ، مثلاً جمہرہ مین ہے کہ عبدالرحمن نے اپنے چچا سے بیان کیا کہ مین نے ایک اعرابی عورت سے سنا کہ اس نے اپنی بیٹی سے کہا ھمّی اصابعك فی رأسی یعنی اپنی انگلیون کو میرے سر مین حرکت دو ھمّی اصابعک ، حرکی اصابعک کے معنی مین بالکل نئی چیز تھی ،

۳- شیخ عزالدین بن عبدالسلام اپنے فتاوائے لغت مین لکھتے ہین کہ عربی زبان کے لغات کی سند عرب شعراء کے اشعار سے ہوتی ہے چاہے وہ کفار ہی کیون نہ ہون ، کیونکہ وہ اپنی زبان مین تدلیس جائز نہ رکھین گے جیسے کہ مسائل طب اکثر غیر مسلم سے قبول کیے جاتے ہین اور کیے جاچکے ہین اس مین بلوغ کی بھی شرط نہین ، مشرکون کی روایت بھی قابل قبول ہے ابن دریدنے عبدالرحمن کی ایک روایت نقل کی ہے جو انھون نے ایک لڑکے سے لی ہے اسی طرح اردو فارسی مین بھی اگر کوئی لڑکا حافظ و سعدی ، میر و داغ وغیرہ کے اشعار پڑھے تو وہ سند مین لیے جاسکتے ہین کیونکہ اس کو کسی قسم کی تدلیس وغیرہ کا خیال نہ ہو گا -

۴- ابن انباری کی راے مین عامی کی روایت بھی قابل قبول ہے بشرطیکہ اسکو جھوٹ کی عادت نہ ہو

۵- اگر کوئی مجہول شخص کسی معین شخص کی طرف نسبت کر کے اس کی روایت بیان کرے تو کمال کے نزدیک قابل قبول ہے اگر وہ کہے کہ مین نے ایک شخص سے سنا لیکن اس کا نام نہین جانتا تو وہ روایت قابل قبول نہ ہو گی -

آپ نے دیکھا کہ ان تمام دفعات مین عدل وصدق احتیاط و بے غرضی مشترک ہین اس سے فن لغت کے اصولی احتیاط کا پتہ چلتا ہے -

ان امور سے یہ مسئلہ صاف ہو گیا کہ جب کسی غیر ذمہ دار شخص کی روایت تک مقبول نہین ہو سکتی تو اسکا خود ساختہ لفظ کہان تک درست اور صحیح ہو سکتا ہے

یہ مسئلہ آگے چل کر اور زیادہ صاف اور واضح ہو گا ،

اخذ لغت کے طریقے تسلسل مضمون اور اخذ نتیجہ کے لیے اس مسئلے پر بھی بحث ضروری معلوم ہوتی ہے کہ اخذ لغت کے کیا طریقے ہین ؟

ائمۂ لغت وادب نے چھ طریقے لکھے ہین :-

۱- کسی معمر اور معتبر شخص یا کسی اہل زبان سے سننا اخذ لغت کا ایک طریقہ ہے

ابن فارسی کی رائے ہے کہ اگر اہل زبان کا کوئی لڑکا بھی لغت بیان کرے تو وہ بھی قابل اعتبار ہے

ابو علی قالی اپنی مشہور کتاب امالی مین لکھتے ہین کہ "ابو حاتم نے ابو عبیدہ سے روایت کی ہے کہ انھون نے خرنق بنت ہفان سے بھی لغت نقل کی ہے،

ایک بار وہ اپنے شوہر کا مرثیہ پڑھ رہی تھی -

ہمارے ایک عرب دوست نے بیان کیا کہ اگر کوئی شخص مختلف قبائل کے محاورات سیکھنا چاہے تو حجاز کے قہوخانہ مین بیٹھے -

۲- دوسرا طریقہ یہ بھی ہے کہ کوئی شخص یہ کہے کہ مین نے فلان شیخ کے سامنے یہ لغت بیان کیا تھا اور اس نے قبول کر لیا -

۳- طریقہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی امام لغت یا اہل زبان کے پاس بیٹھا ہو اور ایک تیسرا شخص لغت بیان کرے اور اہل زبان اس کو قبول کر لے

۴- چوتھا طریقہ یہ ہے کہ کوئی اہل زبان کسی کو اجازت دے دے کہ یہ لغت بیان کرنا یا یہ کہ اپنی کوئی تحریر کسی کو دے دے

حضرت رسول اللہ صلعم نے جو خطوط بادشاہون کے پاس روانہ کیے تھے وہ بھی ایک طرح سے استعمال محاورات کی اجازت تھی - ابن انبار نے اس کو جائز کہا ہے

۵- پانچوان طریقہ مکاتبت اور مراسلت ہے

ثعلب نے اپنی امالی مین لکھا ہے کہ مازنی نے میرے پاس یہ شعر لکھ کر بھیجا اور لکھا کہ اصمعی نے پڑھا تھا

....

۶- چھٹا طریقہ یہ ہے کہ کسی کتاب معتبر مین لغات دیکھے جائین چاہے اسکے مصنف کا نام معلوم نہ ہو سکے،

ابو عبیدہ نے کتاب ایام العرب کا حوالہ دیتے ہوے اس قسم کے اشعار پڑھے کہ وہ سند مین پیش کیے جا سکتے تھے،

اہل زبان و زباندان فارسی اور اُردو کے علاوہ انگریزی اور دوسری زبانہائے یوروپ میں بھی "اہل زبان"، اور "زباندان"، کا اعتبار یہاں تک کیا جاتا ہے کہ ان کے اقوال سند میں پیش کئے جاتے ہیں۔

ہندی زبان کا بھی یہی حال ہے۔

عربوں میں حجاز اور قریشی کی زبان مستند سمجھی جاتی تھی، قرآن پاک اسی زبان میں نازل ہوا، "حدیثیں"، اسی زبان میں بیان کی گئی ہیں۔ فارسی میں شیراز اور اصفہان کی زبان ٹکسالی سمجھی جاتی تھی، ہندی میں (برج یعنے متھرا کی زبان مستند تھی، اُردو میں دہلی اور لکھنؤ کی "زبان"، سند سمجھی جاتی ہے۔

دہلی اور لکھنؤ کے اسکولوں کے متعلق عرصہ سے دو فریق تفوق اور امتیاز کے دعویدار ہیں۔

ہمارا فیصلہ وہی ہے جو آزاد نے آبحیات میں اور مولوی سید احمد صاحب مولف فرہنگ آصفیہ نے "محاکمہ مرکز اُردو" میں کیا ہے۔

آزاد صاحب آبحیات میں لکھتے ہیں کہ:۔

میرے دوستو! تم جانتے ہو کہ ہر شے کی اصلیت اور حسن و قبح کے واسطے ایک مقام ایسا ہوتا ہے۔ کہ جیسے سکہ کے لئے ٹکسال، کیا سبب ہے کہ ابتدا میں دلی ٹکسال تھی؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ دار الخلافت تھی دربار ہی میں خاندانی امرا اور امیر زادے خود صاحب علم ہوتے تھے۔ ان کی مجلسیں اہل علم اور اہل کمال کا مجمع ہوتی تھیں، جنکی برکت سے طبیعتیں گویا ہر شے کے سلیقے اور شائستگی اور لطافت و ظرافت کی قالب ہوتی تھیں، اسی واسطے گفتگو اور لباس، ادب آداب، نشست برخاست، بلکہ بات بات ایسی سنجیدہ اور پسندیدہ ہوتی تھی کہ خواہ مخواہ سب کے دل قبول کرتے تھے۔ ہر شے کے لئے ہمیشہ نئی نئی تراش، نئی نئی اصلاحیں، اور ایجاد و اختراع وہاں سے ہوتے تھے۔ اور چونکہ دار الخلافت میں شہر شہر کا آدمی موجود تھا۔ اس لئے وہ دلپذیر اصلاحیں ہر شہر میں عام ہوجاتی تھیں۔ چنانچہ بہادر شاہ سے پہلے تک وہی جذبات کے لئے سند رہی۔ اور انہی بعضوں سے لکھنؤ نے بھی سند افتخار حاصل کی دلپسند ایجادوں۔ رنگین باتوں کا ایجاد ہونا۔ کسی شہر کے اینٹ پتھر کی تاثیر نہیں، ہاں شائستہ اور رنگین مزاج لوگ جہاں جمع ہوں گے وہیں سے وہ پھول کھلنے لگیں گے۔ چنانچہ وہی دلی کے لوگ اور ان کی اولاد تھی کہ جب تباہی سلطنت اور آبادی لکھنؤ کے سبب سے وہاں پہونچے تو چند روز میں ویسے ہی تراشیں وہاں سے نکلنے لگیں۔ لکھنؤ دار السلطنت ہوگیا۔ اور اس کے ضمن میں زبان بھی دلی کی رعایت سے آزاد ہوگئی۔ (آب حیات صفحہ ۶۶) آزاد ہونے کے یہ معنے نہیں کہ جو محاورات دہلی میں بولے جاتے تھے۔ اہل لکھنؤ نے ان کو ترک کردیا۔ مذموم سمجھنے لگے۔ بلکہ اپنے محاورے بھی شامل کردئے،

اس کی مثال آتی ہے!

مولوی سید احمد صاحب اہل لکھنؤ کو اہل زبان دہلی کے مقابلہ میں زباندان ماننے پر مجبور ہوئے ہیں۔ صاحب تسہیل البلاغۃ نے اس سلسلے میں ایک فیصلہ کن تحریر حوالۂ قلم کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:-

علم اللسان سے زبانوں کے پیدا ہونے ترقی و تبدل اور ان کے باہمی تعلق اور رشتے اور مرنے کی کی کیفیت ظاہر ہوتی ہے، اس کے علاوہ اہل زبان کے محاورے اور روزمرہ کا جاننا بھی ضروری ہے

کسی ملک میں جاؤ اگرچہ سارے قطعہ ارض کا نام ایک ہے، لیکن کسی شہر میں کوئی میوہ اچھا پیدا ہوتا ہے۔ کسی میں کوئی، کہیں ایک صنعت زیادہ ترقی پر ہے کہیں دوسری، لیکن کسی خاص قریہ کے اشیا اور اس کے باشندے اپنے اوصاف میں امتیاز رکھتے ہیں، یہی حال زبان کا ہے کہ سارا ملک یا ملک کا بڑا حصہ ایک زبان بولتا ہے لیکن شہر کی زبان .... دوسروں سے ممتاز ہوتی ہے۔ وہ شہر اس زبان کا مرکز اور وہاں کے باشندے اہل زبان کہلاتے ہیں۔ یہ امتیاز کئی وجہ سے حاصل ہوتا ہے:-

(۱)۔ وہ زبان اس خاص قریہ میں پیدا ہوتی ہے۔ اور وہاں سے تمام ملک میں پھیلتی ہے۔

(۲)۔ شہر کے خاص و عام وہی زبان بولتے ہیں۔

(۳)۔ اس شہر میں ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ جو زبان کو تراش خراش کر خوش نما اصلاحیں دیتے۔ موثر اور دلنشین انداز بیان نکالتے نئے نئے اسالیب بیان پیدا کرتے ہیں، اور زبان کو ایسی وسعت دیتے ہیں کہ وہ ہر طرح ادائے مطلب پر قادر ہو جائے۔

(۴)۔ ان لوگوں کے کلام دوسرے لوگوں کے لئے زباندانی کے سبق آموز ہوتے ہیں، دوسرے شہروں کے لوگ جو اپنی طبعی مناسبت اور اہل زبان کی صحبت یا شاگردی یا ان کے کلام کے مطالعہ سے زبان سیکھتے ہیں۔ "زباں داں" کہلاتے ہیں، ان کا دائرۂ زباں دانی اکتساب کی حد تک محدود ہوتا ہے۔

مولف "محاکمہ" نے تو اس حد تک سختی سے کام لیا ہے کہ وہ سوا "دہلی" کے کسی شہر کو "اہل زبان" بننے کا حق نہیں دیتے، وہ لکھتے ہیں کہ:-

ہند کے اطراف و جوانب کے باشندے گو وہ لکھنؤ۔ اکبرآباد، بنارس، کانپور۔ میرٹھ یا لاہور وغیرہ کے رہنے والے کیوں نہ ہوں دائرۂ تقلید سے خارج نہیں ہو سکتے" (محاکمہ مرکز اردو صفحہ ۵ و ۶) ہماری ذاتی رائے اس تعصب کی موئد نہیں۔ لیکن ہمارے خیال میں جس طرح "انسان" کے لئے ایک مرکز، دار الحکومت، ارباب حل و عقد سلطنت، قوانین ضروری ہیں، اسی طرح زبان کے لئے لازم ہیں۔ ورنہ کوئی چیز مشترک نہیں رہ جاتی، عدم اشتراک

"تمدن" کے منافی ہے، اس لئے کسی جگہ کا "مرکز زبان" ہونا لازم اور ضروری ہے۔ ضرورت مرکز پر سجاد مرزا دہلوی مولف تسہیل البلاغہ حسب ذیل خیالات کا اظہار کرتے ہیں :-

"جو لوگ اچھے زباں داں نہیں وہ اعتراض کرتے ہیں کہ کسی خاص شہر کو مرکز زبان قرار دیکر وہاں کی زباں کو صحت کا معیار قرار دینا ہٹ دھرمی ہے، ان کو معلوم نہیں کہ زبان کے اختلاف سے کیسی کیسی عملی دقتیں پیدا ہوتی ہیں؟ برسر حکومت قومیں اسی وجہ سے کوشش کرتی ہیں کہ ان کی زبان ان کے تمام مقبوضات میں رائج ہے، زبان کی فتح مستقل اور مادی فتح ہے۔ ہماری رائے میں اہل زبان ہونے کے شرائط میں تین پہلی شرطیں ایسی ہیں کہ وہ خود دہلی اور لکھنؤ کو ہندوستان کے دوسرے شہروں سے ممتاز کر چکی ہیں۔

سب سے زیادہ اہم شرط یہ ہے کہ وہ شہر کے عام و خاص ایک ہی زبان بولیں۔ دہلی اور لکھنؤ میں یہ امتیاز نمایاں ہے، دہلی کے متعلق مولف فرہنگ آصفیہ ایک روایت لکھتے ہیں کہ :-

ایک بڑھیا جاڑے کے موسم میں سوں سوں کرتی ہوئی بازار سودا لینے جا رہی تھی، کسی دوکاندار نے پوچھا بڑی بی اس طرح کیوں سکڑتی ہوئی جا رہی ہو؟ اس نے جواب دیا کہ بھائی برف کٹ رہی ہے۔ یہ خاص محاورہ ہے۔ جو غیر اہل زبان کے خاص لوگوں کو بھی میسر نہیں۔ لکھنؤ میں بھی اس قسم کی مثالیں ملیں گی۔

مدینہ طیبہ میں کچھ لوگ پانی کی تلاش میں سرگرداں ایک چشمہ کے قریب پہونچے۔ اتفاق سے اس کا پانی کھاری تھا، ایک سات برس کی عرب لڑکی نے کہا :-

یا حجاج ھذا ماء اجاج ھنالک العذب تحت الباسقات

"حاجیو! یہ پانی کھاری ہے، شیریں پانی وہ کھجوروں کے نیچے ہے۔"

جو لوگ عربی زبان کی خوبی سے واقف ہیں اس فصاحت اور بلاغت پر سر دھنیں گے

سب کے آخر میں اس موضوع پر یہ کہنا مناسب ہوگا۔ کہ "اہل زبان" کے رگ وپے، خون کی روانی میں زبان کی شیرینی اور صحت کا اثر ہو جاتا ہے، یہی چیز ان کے فضل و امتیاز کے لئے ایسی ہے۔ جو دوسروں کے مقابلہ میں قابل تسلیم ہے۔

دہلی اور لکھنؤ کے علاوہ ہندوستان کے اور حصوں میں علما اور شعرا کا ایک وقت میں خاصا مجمع رہا ہے لیکن وہ "مرکز" زبان قرار نہیں پائے۔

"ولی دکھنی" مشہور شاعر کے اشعار اور زبان قابل اعتنا نہ ہوے جب تک انہوں نے "شاہ گلشن" کے مشورے سے ان کو دہلی کے ٹکسالی زبان میں نہیں ڈھالا۔

اضافۂ لغات و محاورات جب انسانی معاشرت اور ضروریات زندگی تخلیق لغات و زبان کا سبب ٹھہریں۔ تو ان میں جسقدر اضافہ ہوتا جائے گا۔ زبان کی وسعت ناگزیر ہے۔

تمام زبانوں کی وسعت کا یہی راز ہے۔

انگریزی زبان کچھ دن پہلے بیس ہزار الفاظ کا مجموعہ تھی، آج چند دنوں بعد ایک لاکھ سے زیادہ الفاظ اس کی ملکیت میں آگئے۔ ابھی ایک لغت تیار ہو رہا ہے۔ جس کے متعلق یہ دعوے ہے کہ بیس لاکھ الفاظ اور محاورات پر حاوی ہوگا، ہم نے اس کا اشتہار دیکھا ہے۔

امریکہ دنیا میں اس وقت سب سے بڑا تجارتی مقام کہا جاتا ہے۔ وہاں کی حالت یہ ہے کہ روزانہ الفاظ اور محاورات میں اضافہ ہو رہا ہے۔

عربی میں پہلے ہزاروں کی تعداد میں عبرانی اور سریانی الفاظ شامل ہوگئے۔ اور اب یوروپ کے الفاظ جگہ لے رہے ہیں۔

مسلمانوں نے جب ایران فتح کیا تو چند ہی دنوں کے اندر فارسی پر عربی چھاگئی۔

عربی میں جو الفاظ عبرانی و سریانی داخل ہوگئے۔ عربوں نے ان کو اس طرح معرب بنایا کہ اصل نقل میں غائب ہوگئی مثلاً:۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم ماخوذ ہے شمار احار ارحیما سے۔

حکیم	حاخام سے
جہنم	جی ہنوم سے
سلام	شلام سے
اسم	اشم سے
مسک	مشک سے

یہودی شالوم علیخیم کہتے تھے۔ لیکن عربی میں یہی السلام علیکم ہوگیا۔

مصری قدیم یعنے ہیرو غلیفی زبان میں "ربی"، رئیس خاندان کے معنے میں تھا۔ عربوں نے اسے بجنسہ لے لیا۔

لاطینی زبان میں (Palatium) پالاٹیم تھا۔ عربوں نے اس کو "بلاط"، کیا۔

یونانی میں کالاموس (Kalamos) تھا عربوں نے "قلم"، کرلیا۔

قرآن نازل ہوا تو اس نے ان الفاظ کو ترک نہیں کیا۔ جو عربی میں رائج تھے اور غیر عربی تھے

اس جگہ اصولی طور پر ایک بات سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ معرب کرنے والے اہل زبان تھے۔ اور کس اصول کے تحت میں تعریب جاری کرتے تھے۔ مثلاً جب کوئی لفظ لیتے تھے تو اس کو اپنی زبان کے وزن، قالب میں ڈھال لیتے تھے۔ اور اس میں تصریف کرتے تھے۔

ایسے بھی الفاظ ہیں جو ان قیود کے تحت میں نہیں آئے مثلاً خراسان۔ ابراہیم۔ اطریفل۔ اہلیلج۔ ابریشم۔ اجر۔ شطرنج۔

ان الفاظ کے لئے عربی میں کوئی وزن نہیں۔ مگر بے تکلف اپنے اشعار میں ان کا استعمال جائز رکھتے تھے۔ مثلاً :۔

قالوا خراسان اقصی ما یراد بنا
ثم القفول فقد جئنا خراسانا

جوہری نے صحاح میں لکھا ہے کہ عرب، عجمی کلمات کو استعمال کرتے تھے تو اپنی زبان کے سانچے میں ڈھال لیتے تھے۔

جوالیقی نے بھی معرب کے متعلق جو کچھ کہا ہے اس کے موافق ہے، اس کی رائے میں اس قسم کے الفاظ کا حکم یہ ہے کہ وہ باعتبار اصل عجمی ہیں اور باعتبار حال عربی۔

ابوحیان نے ارتشاف میں لکھا ہے کہ اسماء عجمیہ کی تین قسمیں ہیں۔

اول۔ وہ اسماء ہیں کہ عربوں نے لے کر اپنی زبان کے اوزان اور اسماء میں ڈھال لیا، مثلاً "درہم" اور "بہرج"

دوم۔ وہ اسماء ہیں کہ ان میں تغیر تو کیا لیکن زبان عربی کے کسی وزن وغیرہ میں نہیں لیا۔ مثلاً "اجر"

سوم۔ وہ اسماء ہیں جنکو ان کی اصلی حالت پر چھوڑ دیا۔ مثلاً "خراسان"

اس اصول تعریب کے علاوہ ائمہ لغات عرب نے عجمی الفاظ کی پہچان کے لئے بھی قواعد اور ضوابط مقرر کئے ہیں، وہ سات ہیں :۔

۱۔ نقل سے معلوم کرتے ہیں کہ فلاں امام نے اس کو لیا ہے۔

۲۔ اسماء عربیہ میں ان کا درست نہ اترنا۔ مثلاً ابریسم۔

۳۔ جس لفظ کا شروع حرف نون ہو۔ اور آخر سین وہ عجمی ہے مثلاً نرجس

۴۔ جس میں زے، دال کے بعد ہو مثلاً مہندز۔

۵۔ جس لفظ میں صاد اور جیم یکجا ہوں مثلاً صولجان

۶ - جس لفظ میں جیم اور قاف اکٹھا ہوں مثلاً منجنیق -
۷ - خماسی اور رباعی ہو لیکن حروف زلاقہ نہ ہوں (حروف زلاقہ ی - ر - ف - ل - م - ن ہیں)
اسی طرح اور ائمہ نے بہت شرطیں لکھی ہیں - ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں - اُردو زبان کا وجود ہی دوسری زبانوں کی دریوزہ گری ہے - اس کو خصوصیات کے ساتھ اہل زبان اور زبان کا محتاج ہونا قرین عقل ہے -
اُردو زبان کو وسعت دینے کے لئے اساتذہ نے فارسی الفاظ اور فارسی محاورات اس طرح لئے کہ وہ اُردو کی ملک ہو گئے مثلاً

۱ - عرق عرق شدن فارسی ہے، اس کو ذوق نے اُردو میں اس طرح لیا ہے ؎

آگ دوزخ کی بھی ہو جائے گی پانی پانی
جب یہ عاصی عرق شرم میں تر جائیں گے

۲ - موئے آتش دیدہ - غالب نے اس طرح لیا ہے :- ؎

بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

۳ - گردن مینا - آتش کا شعر ہے :- ؎

ہر شب شب برات ہے ہر روز روز عید
سوتا ہوں ہاتھ گردن مینا میں ڈال کے

پہلے مصرعہ میں شب برات - روز عید خالص فارسی ہے - لیکن اُردو میں اساتذہ نے رائج کیا ہے -

۴ - منت کشیدن - احسان لینا - مشہور مصرعہ ہے :-

اے دعائے سحری منت تاثیر نہ کھینچ -

۵ - گوش کردن - سُننا - سودا کا شعر ہے :- ؎

کب اسکو گوش کرے تھا جہاں میں اہل کمال
یہ سنگ ریزہ ہوا ہے درعدن مجھ سے

اہل کمال - سنگریزہ - درعدن فارسی ترکیبیں ہیں - جو اُردو میں عام طور پر رائج ہیں -

۶ - زنجیر کردن - زنجیر کرنا - زنجیر پہنانا - انشا نے کہا ہے -

سودا زدہ دل ہے تو یہ تدبیر کریں گے
اس زلف گرہ گیر سے زنجیر کریں گے

سودا زدہ دل - زلف گرہ گیر - فارسی ترکیبیں ہیں -

۷ - لفظ صرف اور صرف دربان خالص فارسی ترکیب ہے - اس کو غالب نے اس طرح لیا ہے :- ؎

تھیں دعائیں جسقدر، وہ صرف درباں ہوگئیں

اگرچہ یہ ترکیب اُردو نے ابتک اور ترکیبوں کی طرح قبول نہیں کی ہے - لیکن فارسی میں بالکل درست ہے -

یہ مرکب ان مرکبات میں ہے کہ ترجمۂ اضافت میں "کے" اور "کی" کی جگہ پر - میں - کے لئے وغیرہ کہا جاتا ہے مثلاً :-

محوِ خیال = خیال میں محو

آمادۂ سفر = سفر پر آمادہ

ناگوارِ طبع = طبیعت کو ناگوار

مستعدِ جنگ = جنگ کے لئے مستعد

لیکن غالب نے اُردو میں لے لیا - اور اس وقت نہ تو کسی نے اعتراض کیا - اور نہ اب کیا جاتا ہے

یہ مرکبات کا حال ہے، مفردات میں ہزاروں سے زیادہ الفاظ اُردو میں رائج ہیں -

عربی مفردات اور مرکبات کا بھی یہی حال ہے مثلاً :-

استغفراللہ - نعوذ باللہ - لاحول ولا قوۃ الّا باللہ - علی الصباح - علی الرغم - علی الدوام - علی الحساب وغیرہ اگرچہ یہ جملے اُردو میں براہِ راست عربی سے نہیں لئے گئے - بلکہ فارسی سے لئے گئے ہیں - لیکن اصلی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں - انگریزی الفاظ بھی اُردو میں بڑھتے جاتے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں - ایک وہ ہیں جنکو اہلِ زبان نے اپنے رنگ میں ڈھالا ہے مثلاً

۱ - لینٹرن	سے	لالٹین
کیمرہ	"	کمرہ
بنگلو	"	بنگلہ
گوڈاؤن	"	گودام وغیرہ

دوسرے وہ ہیں جنکا تلفظ اپنی اصلی شکل میں قائم ہے - لیکن اُردو میں رائج ہیں - مثلاً :-

۲ - مشین - بل - ریلوے لائن اسٹیشن وغیرہ

یہ الفاظ یا تو اہلِ زبان نے اُردو میں لئے ہیں یا ان کا لینا قبول کر لیا ہے -

لغاتِ مخصوصہ ہر زبان میں اہلِ زبان کچھ لغت اور محاورات خلافِ قیاس اپنے لئے مخصوص کر لیتے ہیں - لیکن کسی کو اختیار نہیں کہ اس کو اصول اور قیاس قرار دے کر اور الفاظ میں یہ حکم جاری کرے مثلاً :-

ابن فارسی کا قول ہے کہ "عرب" بعض اوقات ایسے جملے اور لغات بولتے ہیں کہ دوسروں کو تعجب ہوتا ہے مثلاً :-

کہتے ہیں "عاد فلان شیخا"، فلاں شخص بڑھاپے کی طرف لوٹ آیا - یا پھر بوڑھا ہوگیا حالانکہ کبھی نہ تو بوڑھا تھا - اور نہ بڑھاپے کی طرف لوٹا -

قرآن نے اسی معنے میں استعمال کیا ہے "حتیٰ عاد کالعرجون القدیم"

مدح کے موقع پر کہتے ہیں "قاتلہ اللہ ما اشعرہ"

واحد بول کر جمع مراد لیتے ہیں - مثلاً جماعت کے لئے لفظ مفرد "ضیف" اور "عدو" لاتے ہیں

جمع بول کر واحد یا تثنیہ مراد لیتے ہیں مثلاً :-

قرآن میں ہے - ینادونک من وراء الحجرات "تم کو اے محمد جو لوگ حجرے کے پیچھے سے آواز دیتے ہیں -

حالانکہ ندا کرنے والے "صرف ایک صحابی تھے"

بعض مفسرین نے لفظ جمع سے دھوکا کھا کر کئی صحابیوں کا نام ندا کرنے والوں میں بتایا ہے - حالانکہ واقعہ کے بالکل خلاف ہے - اسی طرح سیکڑوں - اور ہزاروں مثالیں ہیں -

اُردو میں بھی واحد بول کر جمع مراد لینے کی مثال یہ ہے "اس کی آنکھ میں جادو ہے" "آنکھوں میں جادو ہے کی جگہ بولتے ہیں - "ہم" ضمیر جمع متکلم شخص واحد استعمال کرتا ہے -

کہتے ہیں ہزاروں آدمی جمع تھا، ہزاروں آدمی جمع تھے کی جگہ - انشا نے دریائے لطافت میں چند مثالیں ان الفاظ کی دی ہیں - جو قواعد کی رو سے صحیح نہیں لیکن اہل زبان بولتے ہیں - مثلاً :-

۱- سفیل	بمعنے	فصیل -
۲- پُھکّر	"	گھومنے والا، گردش کرنے والا -
۳- چپاڑ	"	چوپڑ باز -
۴- مجاز	"	مزاج -
۵- پچاوا	"	پزاوہ -
۶- صفا	"	صفائی -

میر نے ایک جگہ لکھا ہے :- ؎

آئینے کی طرح صفا ہے یہاں

انشا لکھتے ہیں کہ "ہر چہ بر زبان قابل و نا قابل گزرد و در سامعہ پسند اہل اردو ست گو غلط باشد" (دریائے لطافت صفحہ ۲۴۲) یہ نکتہ خصوصیت سے سمجھ لینا چاہیے کہ اس قسم کے الفاظ رواج کے لئے اہل زبان کے محتاج ہیں، جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے اس سے نہ کوئی اصول بن سکتا ہے اور نہ غیر اہل زبان کو کسی قسم کا کوئی اختیار ہے (باقی آئندہ)

محقق اعظمی

اُردو شاعری اور بیکاری

نے بکارِ خویش آمُ نے بکار دیگرے
چوں چراغِ روز میسوزد مرا ایں زندگی

جب پیٹ کی طرف سے اطمینان ہو جاتا ہے تو پھر بیکاری کے مشغلوں کی سُوجھتی ہے۔ کہیں بٹیر بازی کا چرچا ہے۔ کہیں مرغ بازی کی دھوم۔ کوئی کبوتروں کی ٹکڑی اڑا کر دوسروں کے کبوتر پکڑ کر نام پیدا کرتا ہے تو کوئی نواب آصف قدر کو پیدل شہ مات دیکر مشہور ہو جاتا ہے۔ مگر ان تمام بیکاری کے مشغلوں میں شاعری کا نمبر اول ہے۔ نہ کہیں آنے کی ضرورت نہ کہیں جانے کی حاجت۔ بس پلنگ توڑیئے۔ سر کے بالوں میں ہاتھ سے شانہ کرتے جائیے۔ اور دیوان کے دیوان لکھ لیجئے۔ مرزا رسوا "شریف زادہ" میں لکھتے ہیں "لکھنؤ کے اکثر صاحبزادوں کو عنفوان شباب ہی سے عشق بازی کا لپکا پڑ جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی شعر و سخن کی طرف طبیعت ہو جاتی ہے۔ اس بہانہ سے اکثر جائز تخیلات کو عمدہ الفاظ کے پیرایہ میں ادا کرنے کا اچھا موقع مل جاتا ہے"۔ یہ نظریہ صرف لکھنؤ ہی کے لئے نہیں بلکہ ہندوستان کے بیشتر نوجوانوں پر منطبق ہو سکتا ہے۔ جوانی کی آمد آمد کے ساتھ ہی شاعری کی لت پڑ جاتی ہے۔ اور بُری طرح سے پڑتی ہے۔ جسے دیکھئے پنسل کاغذ لئے طبع آزمائی کر رہا ہے۔ اپنے فرضی معشوق کے جور و ظلم کی فرضی داستانیں آنکھ بند کر کے نظم کر رہا ہے۔ واضح ہو کہ حقیقی شاعری مشاہدہ و تجربہ کے بعد آتی ہے نہ کہ چارپائی توڑنے سے۔

اس میں شک نہیں کہ شاعری اخلاق کی درستی کے لئے بہترین شے ہے۔ لیکن کیا شعراء جب شعر لکھنے بیٹھتے ہیں۔ اس امر کو مد نظر رکھتے ہیں کہ ہم آئندہ نسلوں کے لئے اخلاق کا ایک سبق چھوڑے جاتے ہیں۔ شاعری ایک ذوقی اور وجدانی چیز ہے۔ جب آپ پر جذبات طاری ہوتے ہیں یا آپ کسی شے سے لُطف اندوز ہوتے ہیں تو شعر کہنے بیٹھتے ہیں۔ اور جذبات اُسی وقت طاری ہوتے ہیں۔ جب دماغ دنیاوی کشاکش یعنی فکر تحصیل رزق وغیرہ سے خالی ہو۔ اس لئے وہی شخص جس کو کوئی فکر نہو۔ یا یوں سمجھئے جو بیکار ہو شاعری کر سکتا ہے۔ اور شاعری سے .... آپ کا مقصد حصول انبساط ہوتا ہے نہ کہ اخلاق کی تعلیم۔

اگر آپ گلدان میں پھول محفل کی زیب و زینت کے لئے لگائیں اور لوگ اُن سے عرق یا عطر نکال لیں تو آپ کو کیا؟ پتنگ آپ تفریح کے لئے اڑائیں لیکن اگر کہربائی قوت کا راز اس سے معلوم ہو جائے تو یہ خدا کی دین ہے۔ اس لئے معلوم ہوا کہ گو شاعری کے فوائد جو کچھ ہوں یا نکال لئے گئے ہوں لیکن مشغلۂ شاعری مشغلۂ بیکاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی دُور بیں نظریں اپنی

کم مائگی کیطرف اُٹھ گئیں ؎

درجہاں مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ستم　　نے نصیبِ محفلے نے قسمتِ کاشانۂ

یہاں پر ایک سوال یہ ہو سکتا ہے کہ شعر کہتے وقت کوئی مقصد مدِ نظر ہوتا ہے خواہ وہ حصول انبساط ہی ہو اس لئے شاعری بیکاری کا مشغلہ نہیں کہی جا سکتی۔ بیشک اگر آپ ذاتی منفعت دیکھتے ہیں تو کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ لیکن اجتماعی نقطۂ نظر سے قوم کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے آپ اپنی قوم کا نقصان کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کہ آپ کسی اور مشغلہ میں پڑ کر اپنی قوم کو زیادہ فائدہ پہونچا سکتے۔ لیکن اس حالت میں آپ خود غرضی کرتے ہیں کہ آنے والی نسلوں کے لئے اخلاق کا کوئی سبق نہیں چھوڑتے

امر مسلمہ ہے کہ جذبات کی کثرت علم کی قلت کی دلیل ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ لوگ ہما و تخت سلیمان کے خیال سے دلچسپی لیتے تھے۔ لیکن عقلی ترقی اور سائنس کی آمد آمد نے جادوگری۔ طلسمات دیو و پری کے اعتقاد کو سرے سے اُڑا ہی دیا۔ شاعری کی مشین جذبات کی کل سے چلتی ہے۔ اگر عملی زندگی میں انہماک زیادہ ہے تو جذبات سے متاثر ہونے کا کم موقع ملے گا۔ امن و امان اور لوگوں کی طبایع میں اگر جمود کی حالت ہے تو شعر و شاعری کا زیادہ چرچا ہوگا۔ ایران میں ہنگامہ تاتار کے عرصہ میں تقریباً سو برس تک کوئی شاعر نہیں ہوا (سوائے سلمان ساوجی کے)۔ امن و اطمینان کی حالت سے میرا مطلب حکومت کے استقلال سے ہے۔ لیکن لوگوں کے مشاغل کا اثر بھی اس اطمینانی حالت پر کافی پڑتا ہے۔ امریکہ میں باوجود حکومت کے استقلال کے عملی انہماک بہت زیادہ ہے۔ لکھنؤ میں واجد علی شاہی دور کیا آیا۔ بیکاری کا اسکول قائم ہو گیا اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ شاعری مثل میجک لینٹرن کے ہے۔ جسقدر تاریکی زیادہ ہوگی اتنی ہی روشنی زیادہ تیز معلوم ہوگی۔ عرب میں اسی وجہ سے ایام جہالت میں شاعری کی زیادہ گرم بازاری تھی۔ لوگ جذبات سے زیادہ متاثر ہوتے تھے۔ عقل کو کم کام میں لاتے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر لڑ بیٹھتے تھے۔

نیاز صاحب فتحپوری۔ فروری سنہ ۲۳ء کے نگار میں کیا خوب لکھتے ہیں:-

"مشرق کا باشندہ جب جنت کا تصور کرتا ہے تو اُسے خوش منظر باغ نظر آتا ہے جہاں لوگ آرام کرتے ہوئے ہیں امن و سکون کے ساتھ پُر لطف زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اور کسے را بہ کسے کارے نباشد کا جلوہ ہر جگہ پیشِ نظر ہے۔ لیکن مغرب کا رہنے والا۔ فردوس کو عمل و حرکت کی جگہ خیال کرتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے وہاں ایجاد و اختراع کا بازار گرم ہوگا۔ لوگ کاموں میں منہمک ہوں گے اور علم و حکمت اپنی پوری ترقی پر نظر آتے ہوں گے۔ جسوقت امریکہ کا باشندہ بروکلین اور نیو یارک کے درمیان ساحل پر کھڑا ہوتا ہے تو غور کرتا ہے کہ کس تدبیر سے یہاں پُل قائم کر دیا جائے کہ لوگ آسانی سے گزر سکیں۔ برخلاف اسکے مشرق کا باشندہ یہاں آکر صرف ایک نظم کہہ سکتا ہے۔ اسی طرح آبشار نیاگرا کو دیکھ کر مغرب کا باشندہ صرف یہ سوچ سکتا ہے کہ کیونکر اس کی قوت سے کہربائیت پیدا کی جا سکتی ہے اور مشرق کا رہنے والا وہاں صرف گنگنا سکتا ہے۔"

لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ شعر کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جذبات کی پرورش اور اخلاق کی درستی کے لئے شاعری کا

وجود ایک بیش بہا شے ہے۔ انسان میں جذبات قدرت کی طرف و دلیعت کئے گئے ہیں۔ کبھی ہنسنا کبھی رونا کسی سے محبت کرنا کسی سے نفرت کرنا۔ لگا ہی رہتا ہے اور پھر مدنی حالت میں تو ان کی کثرت اور بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ ادیب صاحب ہماری شاعری میں لکھتے ہیں کہ

"یہ سچ ہے کہ شعر سے لازمی طور پر کوئی مالی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن اگر ذہن کی تیزی، دل کی شگفتگی، روح کی بیداری اور اخلاق کی استواری کا شمار بھی فائدوں میں ہے تو شعر و شاعری کے مفید ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے۔ شاعری بے حس قوتوں کو چونکاتی ہے، سوتے احساس کو جگاتی ہے، مُردہ جذبات کو جلاتی ہے، دلوں کو گرماتی ہے، حوصلوں کو بڑھاتی ہے، مصیبت میں تسکین دیتی ہے، مشکل میں استقلال سکھاتی ہے، بگڑے ہوئے اخلاق کو سنوارتی ہے۔ اور گری ہوئی قوموں کو ابھارتی ہے۔"

سینکڑوں موقعوں پر بڑے کام آئی ہے، مشکلوں میں آڑے آئی ہے، گرتے ہوؤں کو سنبھالا ہے۔ بھاگتے ہوؤں کو لڑایا ہے تاریخ مثالوں سے پُر ہے۔ اور اصل تو یوں ہے کہ دنیا میں رونق، چہل پہل انھیں جذبات کی بدولت ہے ورنہ بقول شبلی اگر یہ چیزیں مٹ جائیں تو دفعتاً سناٹا چھا جائے اور دنیا قالب بیجان، شراب بے کیف، گل بے رنگ، گوہر بے آب ہو کر رہ جائے۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے ؎

گلشن دہر میں اگر جوئے مئے سخن نہ ہو		پھول نہ ہو کلی نہ ہو سبزہ نہ ہو چمن نہ ہو

ایک مشہور مثل ہے کہ شاعری ایک چمکنے والی آنکھ ہے۔ اور فلسفہ اونگھنے والی پلکیں۔ فلسفیوں اور سائنسدانوں سے اگر پوچھو گے کہ شاعری کیا چیز ہے اور اس کے کیا فائدے ہیں تو وہ ایسے ایسے پست کن ناموں سے اسے تعبیر کریں گے کہ تم اس سے متنفر ہو جاؤ گے۔ کیوں۔ کیونکہ اور کیسے کے پھندوں میں پھنسا کر اسے بالکل لایعنی بتا دیں گے۔ ہر طریقہ سے اس کی مذمت کریں گے۔ سائنس اور فلسفہ واقعات سے تعلق رکھتے ہیں ان کی نگاہیں پھول کے اجزا کو دیکھتی ہیں۔ خوبصورتی سے کوئی تعلق نہیں یا یوں سمجھئے کہ وہ اپنی خشکی میں فنون لطیفہ کی "تری" کو دخل انداز نہیں ہونے دیتے۔ لیکن ٹائبہ کے "جب سائنس اور مشاہدات کی ممارست ہم کو سخت دل اور کٹر بنا دیتی ہے۔ اور تمام معتقدات اور مسلمات عامہ کے دل میں حقارت پیدا ہو جاتی ہے کسی بات کا اعتبار نہیں آتا۔ کسی چیز کا اثر نہیں رہتا۔ اسوقت شاعری ہمارے دل کو رقیق اور نرم کرتی ہے۔ .... مادیت کے بجائے روحانیت قائم ہوتی ہے۔ شاعری ہم کو عالم تخئیل میں لے جاتی ہے۔ جہاں تھوڑی دیر کے لئے مشاہدات کی بیرحم حکومت سے ہم کو نجات مل جاتی ہے۔"

جوش ملیح آبادی ان کو مخاطب کر کے کہتے ہیں :-

رحم اے نقادِ فن یہ کیا ستم کرتا ہے تو		کوئی نوکِ خار سے چھوتا ہے نبضِ رنگ و بو
شاعری اور منطقی بحثیں ہمیکیسا قتلِ عام		برشِ مقراض کا دیتا ہے زلفوں کو پیام

فکر کا جسکی حواس ظاہری پر ہو مدار شاعری کے قصرِ مدہوشی میں پاسکتا ہی بار
کیوں اوٹھا ہی جنس شاعر کے پرکھنے کیلئے کیا شمیم سنبل و نسریں ہی چکھنے کے لئے
شعر کی تنقید سے پہلے مری تقریر سُن خود زبان شاعری سے شعر کی تفسیر سُن
اک ترنم سے لب تنقید کھلنا چاہئے
قطرۂ شبنم کو برگ گل پہ تُلنا چاہئے

یہ مثل کہ شاعری جزویست از پیغمبری اسی وجہ سے درست ہے کہ جس طرح ایک پیغمبر دنیا میں آکر لوگوں کو قعرِ مذلت سے نکالتا ہے انکی اخلاقی حالت درست کرتا ہے، ظلمت سے روشنی میں لاتا ہے۔ اپنی قوم کی پستی کو دور کرتا ہے، ان کو تمدن و تہذیب کا صحیح مفہوم بتلاتا ہے اسی طرح ایک شاعر بھی اپنی قوم اور ملک کی جہالت، ان کے نقائص اور ان کے عیوب کو مٹانیکی کوشش کرتا ہے۔ راہ گم کردہ کو صحیح راستہ پر لگاتا ہے، بھٹکتے ہوؤں کو منزل پر پہونچاتا ہے، ڈوبتوں کو ساحل پر لاتا ہے۔ بہرحال اپنی قوم کی حالت درست کرنے میں ہر طرح کی امکانی کوشش سے دریغ نہیں کرتا۔ ولیم بلیک لکھتا ہے کہ

"محدود شاعری انسانی نسل کو بھی محدود کردیتی ہے۔ قومیں اوسی نسبت سے ترقی کرتی یا برباد ہوتی ہیں جس نسبت سے ان کی شاعری، مصوری اور موسیقی ترقی کرتی یا برباد ہوتی ہے"

شاعر ہر وقت انسان کی بھلائی اور بہتری کی تدبیریں سوچا کرتا ہے۔ جنگلوں اور صحراؤں میں بادیہ پیمائی کررہا ہے تو یہی خیال اس کے پیش نظر ہے۔ ریگستانوں میں مائل دشت نوردی ہے۔ تب بھی قوم کا مرثیہ اس کی زبان پر ہے۔

An tacitum silvas inter reptare salubres cur-antum quidquid dignum sapiente bonoque est.

(وہ خاموش پُر فضا جنگلوں کی دشت نوردی کرتا ہے۔ لیکن اس کا دماغ دانائی اور بھلائی کے خیالوں میں مصروف ہے)

وہ گو بظاہر دیوانوں کی سی صورت بنائے ہے مگر سوچتا دُور کی اور کہتا پتہ کی ہے۔ اپنے ملک اپنی قوم کے پیچھے پاگل ہو رہا ہے۔ ہر طرح کی کوشش کرتا ہے۔ لاکھوں طرح کے جتن کرتا ہے کہ اس کے بھائی بند ٹھیک راستہ پر چلنے لگیں۔ حکومت سے زیادہ اس کو ان کی بھلائی کی فکر رہتی ہے۔ ۔ ۵

محفل نظم حکومت چہرۂ زیبائے قوم شاعر رنگیں نوا ہی دیدۂ بینائے قوم

اِس میں شک نہیں کہ خیالات کو مجتمع اور یکسوئی قلب کے لئے مکمل خاموشی کی ضرورت ہے۔ ظاہراً ایک کاروباری آدمی کو ایسے لمحات میسر نہیں آسکتے۔ لیکن وہ بھی پہلو میں دل رکھتا ہے۔ احساسات اور جذبات کی دنیا اس کے قلب میں بھی آباد ہے۔ دن بھر کا تھکا ماندہ جب مکان آتا ہے۔ بچے پیار سے چمٹ جاتے ہیں۔ اگر ایک بچہ خوشی کے مارے ٹانگوں سے لپٹا جارہا ہے تو دوسرا کاندھے پر سوار ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ بیوی الگ نیچی نظروں سے انکی حرکات دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ کون

کہہ سکتا ہے کہ اُس شخص کے لئے یہ اظہار انبساط، یہ مسرت خوش کُن نہیں ہے - اگر اُس کو اپنے پیشہ میں نقصان ہوا ہے تو اس خسارہ کا اثر کوئی اس کے دل سے پوچھے - چہرہ پر افسردگی چھائی ہوئی آنکھوں میں حلقے پڑے حیران پریشان بیٹھا ہے - ان ہر دو متضاد حالتوں میں اگر وہ اپنی حالت لکھنے کی کوشش کرے گو وہ غم غلط کرنے کے طور پر سہی تو وہ لٹریچر کے انمول جواہر میں شمار کئے جائیں گے - اگر نظم میں پیش کرے تو پھر یہ اس کی آتش بیانی آگ ہی لگا دیگی - مطلب یہ ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ کاروباری شخص کا دل مردہ ہو جاتا ہے - اور اپنے پیشہ میں انہماک کی وجہ سے اُسے اپنے جذبات کے ظاہر کرنے کا موقع نہیں ملتا اور اگر ملے بھی تو وہ زیادہ موثر نہ ہو گا باطل ہے -

رہی شاعر کی ہیئت کہ گم صم بیٹھے ہیں تو یہ واقعہ ہے کہ شعر لکھنے کے لئے تنہائی اور خاموشی ضروری ہے - جب تک فضا میں خاموشی نہ ہو گی - اس کے خیالات پراگندہ اور پریشان رہیں گے - یکسوئی قلب اور خیالات کا مناسب اجتماع نہ ہو سکے گا - انسان کو جب کوئی اہم اور غور طلب مسئلہ حل کرنا ہوتا ہے تو خاموشی اور خلوت چاہتا ہے - اور پھر شاعری تو ایسی نازک چیز ہے کہ ذرا سی لغزش پر شاعر کی تمام جد و جہد، غور و فکر برباد ہو جاتی ہے - اس لئے اگر وہ شہر کے غل شور سے پناہ لینے کے لئے کسی پُر فضا مقام پر جا بیٹھتے ہیں تو یہ جائے استہزا اور طعن نہیں - آرتھر آف شاغنزے نے خوب کہا ہے :-

We are the music makers
And we are the dreamers of dream.
Wandering by lane sea breakers,
And sitting by desolate streams,
World losers and world for-sakers,
On whom the pale moon gleams,
Yet we are the movers & shakers,
Of the world it seems,

ترجمہ :- "ہم آفرینندۂ موسیقی ہیں اور ہم خواب و خیال میں پڑے رہتے ہیں - سمندر کے خاموش ساحلوں پر گھوما کرتے ہیں اور سنسان چشموں کے کنارے بیٹھے رہتے ہیں - ہم خانہ بدوشوں اور گوشہ نشینوں پر زرد چاند اپنی پھیکی روشنی ڈالتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہی ہیں جو دنیا کو لرزاں اور تہ و بالا کر دیتے ہیں"

موسیقی ایسی چیز ہے کہ انسان تو انسان حیوان کو بھی اپنی طرف مائل کر لیتی ہے - لحن داؤدی ایک قصہ پارینہ سہی مگر آج بھی گراموفون کی دلکش آواز راہ گیروں کو روک لیتی ہے - انسان کسی اہم کام میں مشغول کیوں نہ ہو گویے کی ایک تان اس کو اپنی طرف راغب کر لیتی ہے - شعر موسیقی کے زیور سے آراستہ ہو کر ایسا دیدہ زیب ہو گیا ہے - کہ بہتوں نے نقد جان دے دیا ہے - کتنا ہی مغموم

کوئی کیوں نہو لاکھوں تسلیاں اور تشفیاں اس کو گریہ وزاری سے روک نہ سکتی ہوں مگر ایک پھڑکتا اور چبھتا ہوا۔حسب حال شعر اس کو بشاش اور مطمئن کردیتاہے۔ اشعار تو کارلائل کے نزدیک موسیقیانہ خیالات ہیں۔مشرقی معلموں اور مذہب کے بانیوں نے خصوصاً ہندوستان میں اسی شاعری کی بدولت سینکڑوں کے دل موہ لیئے ہیں۔دلکش آواز میں بھجن گا گا کر لاکھوں کو اپنا ہم مذہب بنالیا گیاہے۔شاعری جذبات کے ابھارنے میں نظیر نہیں رکھتی روحانی تعلیم کے لئے بہترین ذریعہ ہے۔انسان کا دل فوراً ہی نرم ہوکر اس معبود حقیقی کیطرف متوجہ ہوجاتا ہے جو نظام دہر میں ہیدا بھی ہے پنہاں بھی ہے، معرفت کے منازل طے ہونے لگتے ہیں۔ ظاہری پردے اٹھنے لگتے ہیں اور پھر بندہ ہوتا ہے اور بندہ نواز۔

اس کے علاوہ ماہرین تعلیم کی رائے ہے کہ نظام تعلیمات میں شعر کو جگہ ضرور ملنا چاہئے کیونکہ اس سے قوت متخیلہ ترقی پذیر ہوتی ہے۔اور قوت متخیلہ ہی ایسی شئے ہے جس کی ترقی اور نشوونما طالب علم کے لئے اشد ضروری ہے۔تمام ایجادات واکتشافات اسی قوت کے منت پذیر ہیں۔جس طالب علم میں یہ قوت ترقی کریگی اتنا ہی وہ تیز اور ذکی ہوتا جائیگا۔شعر بوجہ ترنم اور ترتیل کے جلد یاد ہوجاتا ہے۔اس لئے حافظہ کو کافی مدد دیتا ہے۔

مختصر یہ کہ شعر سے ہمکو کافی فائدے حاصل ہوتے ہیں خواہ وہ شاعر کے مد نظر رہے ہوں یا بعد میں لوگوں نے اخذ کرلئے ہوں۔ .... اس لئے شاعری کسی طرح سے بیکاری کا مشغلہ نہیں کہی جاسکتی اور حقیقت تو یہ ہے کہ جب تک انسان میں جذبات ہیں اور وہ بالکل مشین ہوکر نہیں رہ جاتا شاعری ہمیشہ زندہ رہے گی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہاں شاعری بیکاری کے مرادف کیونکر ہوگئی جسے دیکھئے اُردو شاعری سے متنفر اور اس کو لغو او فضول کہتا ہے اور حد تو ہوگئی کہ شاعری اور بیکاری ایک مثل سی ہوگئی ہے۔

شاعری کا دارومدار تخیل اور محاکات پر ہے۔

طبائع انسان اُن اشیاء سے جو مرئی ہیں زیادہ حظ حاصل کرتے ہیں بہ نسبت ان کے جو ہم کو نظر نہیں آتیں یا بہ سبب ہماری حواس کی کمزوری کے نہیں دکھلائی دیتیں۔تاج محل کی تعریف اور خوشنمائی کا ذکر اُس شخص پر زیادہ اثر کرے گا۔جس نے اُسے دیکھا ہے۔بہ نسبت اس کے جس نے اُسے نہیں دیکھا ہے۔اسی لئے ارسطو شاعری کو بوجہ محاکات کے موثر سمجھتا تھا۔میتھو آرنلڈ اپنے تنقیدی مقالات میں شاعری کی بابت لکھتا ہے کہ

"شاعری خیالات سے وابستہ ہے اور خیالات واقعات ہوتے ہیں۔"

لیکن ہمارے یہاں اردو شاعری میں واقعات تو ہوتے ہی نہیں صرف خیالات ہی خیالات ہوتے ہیں۔تخیل کو بغیر محاکات کے ...... استعمال کرتے ہیں۔نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ٹھوکر کھاتے ہیں۔مغرب میں شاعری بیکاری کیوں نہیں سمجھی جاتی صرف اس وجہ سے کہ اُن کے خیالات واقعات پر مبنی ہوتے ہیں۔جھوٹ، کذب اور افترا نہیں ہوتا۔محاکات کے قرطاس پر تخیل کے موقلم

سے رنگین تصویریں بنائے ہیں۔ فارس میں قصیدہ سب سے پہلے شروع ہوا۔ جب کسی کی مدح یا ذم کی جاتی ہے۔ تو اس میں محاکات کو دخل نہیں ہوتا۔ اور ہو ہی کیا سکتا ہے۔ صرف تخیل کی بلند پروازی دکھلانا پڑتی ہے۔ جھوٹی تعریف ہوتی تھی۔ اور جھوٹی باتیں نظم ہوتی تھیں۔ جب خلفائے بنو عباسیہ اور بادشاہ ایران اپنی جائز و ناجائز مدح کے عادی ہو گئے تو پھر کیا تھا۔ ہر شاعر بلند پروازی میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی اور مقرب بارگاہ ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تخیل میں بے اعتدالیاں ہونا شروع ہو گئیں۔ دُور از کار خیالات باندھنا شروع کئے۔ جس کا حشر یہ ہوا کہ اثر شعر زائل ہو گیا۔ درباروں میں صرف واہ واہ تک ان کا کلام باقی رہا۔ اس کے بعد کسی نے پوچھا بھی نہیں۔ نمونے ملاحظہ ہوں۔ سلمان ساوجی سلطان جلال الدین حسن شاہ کی تعریف میں لکھتے ہیں:-

صد بار گرد بالش خورشید سر نہد　　تا شاہ زیر دست خود اورا مکاں دہد
روزے کہ گرد لشکر مریخ رزم شاہ　　بر جبیس راز شعر سیہ طیلساں دہد
بہر ہنروراں کہ ہیجا ز علیہما　　عارض چو عرض جوشن برگستواں دہد
رُمحت میان بستہ نہد بہر دام و دد　　یک خواں کہ شرح رزمگہ ہفتخواں دہد
چوں چرخ پیر طلعت بخت ترا بدید　　گفت ار دہد مرادم از آں نوجواں دہد

صفات عصمت ذاتش کہ عین مردمی است　　سواد کردہ ملک بر بیاض دیدۂ حور
زہے نقود کلام ترا عیار گہر　　زہے غبار سمند ترا خواص وزور
لوئی کہ بر صفحات فلک بخط غبار　　بود مآثر نعل مواکبت مسطور

ظہیر فاریابی اپنے ممدوح کی یوں تعریف کرتے ہیں:-

نہ کرسی و فلک نہد اندیشہ زیر پائے　　تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلاں دہد
در موضع کہ چوں دم روح القدس زند　　نصرت ہمائے رایت او را مکاں دہد
بیروں ز کائنات پرد تا ہزار سال　　سیمرغ وہم تا ز جنابش نشاں دہد

اور چونکہ درباری شعراء بڑی شہرت اور قابلیت کے ہوتے تھے۔ اس لئے ان کی زبان۔ ان کی بات مستند مانی جاتی تھی۔ اس لئے عام شاعروں کو بھی انہیں کی تقلید کرنا ضروری ہوتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب ایک ہی رنگ میں رنگ گئے اور صرف تخیل کی ترقی میں منہمک رہے۔ اور اس میں بڑی بڑی بلند پروازیاں دکھلائیں۔ لیکن آخر زوال شروع ہی ہو گیا۔ لغو اور لایعنی باتیں بکنے لگے۔ اکثر اچھی باتیں بھی کہتے تھے۔ مگر وہ بھی بُری طرح سے۔ مبالغہ غلو کی حد تک پہونچ گیا۔ اس کا اثر اردو پر بھی پڑا۔ یہاں بھی وہی رنگ جما۔ شہباز تخیل آسمان کی خبر لینے لگا

ذوقؔ اپنے ایک قصیدے میں لکھتے ہیں:۔

چھیڑے تارِ شمع کو گر ناخنِ موجِ نسیم — بزم میں پیدا ہو تارِ سازِ مطرب کی صدا
جسم کو مَل مَل کے دھویا تو نے جس دم وقتِ غسل — گردِ کلفت کو دلِ عالم سے گویا دھو دیا
سردیٔ حنا ہو پہنچے ہے عاشق کے جگر تک — معشوق کا گر ہاتھ میں ہو دستِ حنائی
کیا صرف ہوا کا ہے کہ تاثیر ہوا سے — گردوں پہ بھی خورشید کا دیدہ ہوائی
دو نکتے یار کے پشتِ لبِ شیریں پہ نہیں — شہد پر بیٹھ کے ہیں پائے مگس ٹوٹ گئے
ڈرتا ہوں اس کا خنجر نہ بہہ جائے ہو کے آب — میرے گلے میں نالۂ آہن گداز ہے
گھوڑے کی کیا سبک روی یاں میں کروں بیاں — مارے حباب کو یہ اگر ٹھوکر آب میں
ق
سُم میں تری نہ آئے نہ ٹوٹے حبابِ بحر — عکسِ خیال ہو یہ ہوا بنکر آب میں — منیرؔ
خمیدہ ضعف سے ایسا میں دردمند ہوا — کہ سایہ پاؤں کا سر سے مرے بلند ہوا — خواجہ وزیرؔ
سنتے ہیں وہ عشاق کی آہیں پسِ دیوار — پھر یہ بھی شکایت ہے کہ گرمی ہے ہوا میں — داغؔ
کیا ہاتھ میں درکار امیرؔ انکو ہے مہندی — چھولیں گُلِ عارض تو وہی رنگ حنا ہو — امیرؔ

چنانچہ ہر صنفِ شاعری میں یہاں بھی تخیّل کی زیادتی پائی جاتی ہے۔ نتیجہ ہوا کہ ایسے ایسے نازک شعر نکلنے لگے کہ سمجھنے والوں کو دقت ہونے لگی مثلاً

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی — ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا
دوزخ شود ز خاصیتش باغِ خلد اگر — روید بگردِ چشمۂ کوثر گیاہِ ما
کیا نزاکت تھی کہ عارض انکے نیلے پڑ گئے — ہمنے تو بوسہ لیا تھا خواب میں تصویر کا

بھلا ایسی شاعری سے کیا فائدہ۔ اپنا وقت خرچ کیا دماغ صرف کیا۔ اور کچھ نہیں اسی نازک خیالی کی دھن اور فضول غور و فکر اور صمٌّ بکمٌ بیٹھے رہنے نے شاعری کو بیکاری کا مشغلہ بنا دیا

حکومت کا اثر رعایا پر کافی پڑتا ہے۔ جیسا دربار کا رنگ ہوتا ہے وہی حالت رعایا بھی اختیار کر لیتی ہے۔ رنگیلے پیا جانِ عالم کے زمانہ میں بٹیر بازی، مرغ بازی اور اس کے ساتھ ساتھ شاعری کا جیسا دَور دورہ تھا۔ وہ ظاہر ہے اور اسی طرح کی حالت ہر اس بادشاہ کے زمانہ میں ہوئی ہے جو طبیعت کا شوقین رہا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ

ہر کوچہ معلمے ستادہ — ہر گام فلاطنے نہادہ

ہر کہ ومہ شاعری کی لت میں پڑ جاتا تھا۔ جسے دیکھئے میرؔ و غالبؔ ہو رہا ہے۔ مشاعرے کافی سے زیادہ ہوتے تھے ہر بیکار پنسل و کاغذ لئے شعر سوچ رہا ہے زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا ہے۔ اور موضوع وہی عشق (واضح ہو کہ معاملاتِ عشقیہ

میں بھی حسب عادت وہی تخیئل سے کام لیا جانے لگا۔ جب حد اعتدال سے بڑھ گیا تو معشوق ظلم کی اس حد تک پہونچ گیا کہ اس کی ایک نظر سینکڑوں کو زخمی کر گئی اس کے ایک اشارہ ابرو نے لاکھوں کو تہ تیغ کر دیا۔ اس کا کوچہ کا ہے کو ہے عاشقوں کی ایک چھوٹی سی بستی ہے کوئی ادھر لوٹ رہا ہے کوئی ادھر تڑپ رہا ہے۔ دوسری قوم کے ارباب سخن اُردو شاعری پر یہ بڑا اعتراض کرتے ہیں اور یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے مگر اس کا سبب تخیئل کی بے اعتدالی ہے مغربی شاعری اور ہندی شاعری میں محاکات کو بڑی حد تک دخل ہے۔ اس لئے ان کی شاعری بہ نسبت اردو کے زیادہ مستحکم ہے۔ اُردو کے سینکڑوں شاعر ایسے ہوں گے۔ جن کی عمر بھر کی کمائی یعنی ان کے دیوان کو کوئی پوچھتا بھی نہیں اور گمنامی کی حالت میں پڑے ہیں اور کون پُوچھے اور کیسے پوچھے جبکہ آپ زبردستی اپنے اوپر جذبات طاری کر کے شعر کہتے ہیں۔ قافیے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پہلے ہی رکھ لیتے اس کے بعد ان پر طبع آزمائی کرتے ہیں۔ یا یوں سمجھئے کہ پہلے تو ہاتھ پاؤں زنجیروں سے کس دیتے ہیں۔ اس کے بعد دوڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قوت تخیئل کو اسقدر لالیعنی اور فضول باتوں میں صرف کرتے ہیں جنکا بیان نہیں۔ کہیں گاؤ زمین کو دیکھتے ہیں تو کہیں ہما کی طرف نظر اٹھاتے ہیں۔ کہیں تخت سلیمان پر اُڑتے ہیں تو کہیں سیمرغ کے ساتھ پرواز کرتے ہیں۔ بیکار اپنی زندگی تباہ کرتے ہیں اور دوسروں کا مذاق خراب کرتے ہیں اور آخر کار یہ کہتے ہوے سدھار جاتے ہیں کہ

دریغا می ندانستم طریق زندگانی را ۔۔۔ بباطل صرف کردم نقد ایام جوانی را

اور انہیں شاعروں کی خدائے تعالیٰ قرآن شریف میں یوں مذمت کرتا ہے

وَالشعراء یتبعھم الغاوٗن ۝ الم تر انھم فی کل وادٍ یھیمون ۝ انھم یقولون مالا یفعلون ۝

(اور شاعروں کی بات پر چلیں وہی جو بے راہ ہیں۔ تو نے نہیں دیکھا کہ وہ میدان میں سر مارتے پھرتے ہیں اور یہ کہ وہ کہتے ہیں جو نہیں کرتے)

نور الحسن ہاشمی سندیلوی

فلسفۂ مذہب

اُردو زبان میں بالکل پہلی کتاب جو ایک شخص کو مذہب کی حقیقی اہمیت اور اسلام کے سچے مفہوم سے آگاہ کرتی ہے۔ ان مضامین کے سلسلہ نے مُلک میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ اس کتاب کے صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں۔ قیمت معہ محصول عہ

منیجر نگار لکھنو

باب الاستفسار

ابتدائے عہد اسلام کے اسلحۂ آتشبار

(جناب محمد مظفر خاں صاحب - کلکتہ)

کیا آپ براہِ کرم مطلع فرما سکتے ہیں کہ ابتدائے عہد اسلام میں اسلحۂ آتشبار استعمال ہوتے تھے یا نہیں اور اگر ہوتے تھے تو ان کی صورت و نوعیت کیا تھی؟

(نگار) تاریخ سے ثابت ہے کہ مسلمان بری و بحری دونوں جنگوں میں آگ کا استعمال کرتے تھے جس کو مورخین مابعد نے نارِ یونانی کے نام سے موسوم کیا ہے - اس کو بعلبک کے ایک مشرقی شخص نے بازنطینی حکومت کے لئے ایجاد کیا تھا - جو عربوں کے حملۂ قسطنطنیہ سے بیحد پریشان ہو گئی تھی اور کسی نہ کسی طرح ان کے نہب و غارت کو دفع کرنا چاہتی تھی - اس آگ کا استعمال عرصہ تک بازنطینی حکومت راز کی صورت میں کرتی رہی، لیکن آخر کار عربوں کو بھی اس کی ترکیب معلوم ہو گئی - اور پھر انہوں نے اس کے استعمال کے متفرق و متعدد طریقے اختیار کئے -

محمد بن منکلی کا بیان ہے کہ

"اہل عرب کشتیوں کے اندر سے فریق مخالف پر روغن نفط پھینکتے تھے جس کو یونانی زبان میں تیلوئیہ کہتے تھے - اور وہ خود زراقات کے نام سے موسوم کرتے تھے - ان سے نہایت سخت تڑاقا اور دھواں پیدا ہوتا تھا - اور دشمن کی کشتی میں آگ لگ جاتی تھی"

نفط فی الحقیقت وہی چیز ہے جسے اب پٹرول کہتے ہیں اور جو اُس وقت سرزمین بابل میں بکثرت پیدا ہوتا تھا - یہ سفید و سیاہ

دونوں رنگ کا ہوتا تھا۔ اور فوراً مشتعل ہو جاتا تھا۔

روغن نفط کا استعمال ایک تو نلکیوں کے ذریعہ سے ہوتا تھا اور دوسرا طریق استعمال بالکل وہی تھا جسے اب بم پھینکنے سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ لوگ تانبے کی گول ہانڈیوں میں اور صندوق و ظروف میں نوکدار چیزیں چاقو وغیرہ کی قسم سے بھر دیتے تھے۔ اور پھر روغن نفط ڈال کر، گوپھن (منجنیق) کے ذریعہ سے اس کو دشمن پر پھینکتے تھے۔ اس طرح وہ پتھر کے گولے بھی بناتے تھے۔ جنکے اندر چار خانے ہوتے تھے۔ اور نفط و مصطگی وغیرہ سے بھر کے سر کرتے تھے۔ علاوہ ان کے شیشے اور بوتلیں بھی اس ترکیب سے استعمال کرتے تھے۔

بری جنگوں میں دستی بم بھی انھوں نے استعمال کئے جو دستہ دار شیشوں اور بوتلوں سے بنائے جاتے تھے۔ چنانچہ دولت عباسیہ کے دَور اوسط میں عماد الدولہ بن بویہ کے لئے یاقوت المنادی نے اس کا استعمال کیا تھا۔ اور کامل ابن اثیر نے اس کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔

مسلمانوں نے روشن بموں کا بھی استعمال کیا ہے۔ یہ ایک قسم کا گولا ہوتا تھا۔ جو گندھک، گوند، روغن بلساں وغیرہ سے ترکیب دیکر خشک کر لیا جاتا تھا۔ جب اس کو جلانا مقصود ہوتا تھا تو اس پر روغن نفط سفید مل دیا جاتا۔ اور گندھک پیس کر چھڑک دی جاتی۔ جس وقت اس کو ایک سخت کمان کے ذریعہ سے پھینکتے تو ہوا کی رگڑ سے اس میں آگ پیدا ہو جاتی اور گولہ روشن ہو جاتا۔

علاوہ ان کے وہ پھسلنے والے گولے بھی استعمال کرتے تھے یعنی وہ ہانڈیوں میں صابون اور اسی طرح کے دوسری لیسدار چیزیں بھر کر منہ بند کر دیتے تھے۔ اور کشتیوں پر پھینکتے تھے جہاں وہ جاکر ٹوٹ جاتی تھیں اور کشتی کی سطح اسقدر چکنی ہو جاتی تھی کہ پاؤں نہ ٹھہر سکتے تھے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کرتے کہ ہانڈیوں میں سانپ اور بچھو بھر کر پھینکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ایک طرف لوگ پھسل پھسل کر گرتے اور دوسری طرف سانپ بچھو ڈسنے لگتے۔

ایک خاص قسم کے گولے وہ ایسے بھی بناتے تھے جو صرف جلد کو جلا ڈالتے تھے اور جسم کے اندر کوئی چیز ان میں سے نکل کر پیوست نہ ہوتی تھی۔

تدبیر حرب میں ایک طریقہ یہ بھی اختیار کیا جاتا کہ اپنے کو ہزیمت شدہ ظاہر کر کے پسپائی اختیار کی جاتی۔ لیکن پسپائی کے ساتھ ساتھ راستہ میں وہ روغن نفط چھڑکتے جاتے تھے۔ جب دشمن ان کے تعاقب میں اس راستہ سے گزرنے لگتا تو اس کو آگ دکھا دیتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ساری فوج آگ کے نذر ہو جاتی۔

اسی کے ساتھ گوکھروں کا بھی استعمال ہوتا تھا۔ یہ کانٹے دار گوکھرو جو لوہے کے بنائے جاتے تھے، خندقوں کے چاروں طرف، دشمن کے راستے میں بچھا دیے جاتے تھے۔ جس سے گزرنا سخت دشوار تھا۔

جرمنی نے حال کی جنگ عظیم میں گیس کے زہریلے گولے استعمال کئے تھے اور لوگوں نے اس کو بالکل جدید چیز سمجھی، حالانکہ اب سے بہت قبل مسلمانوں ہی نے اس چیز کو سب سے پہلے ایجاد کیا تھا۔

اس کے دو طریقے تھے ایک تو یہ کہ جب دشمن کی طرف ہوا کا رُخ ہوتا تو گندھک اور لالٹینیں جلا جلا کر دھوئیں کو دشمن کی طرف بھیجتے۔ جس سے وہاں کی ہوا خراب ہو جاتی اور ٹھیرنا دشوار۔ دوسرا طریقہ دم بند کرنے والے لوگوں کے استعمال کا تھا۔ ان گولوں میں کبھی افیون و ہرتال وغیرہ بھرتے تھے۔ اور کبھی بغیر بجھا ہوا چونا سفوف کی صورت میں۔ اس کے دھوئیں سے دم گھٹنے لگتا تھا۔ اور بصارت کام نہ دیتی تھی۔

تیروں، نیزوں اور دبابیں میں بھی وہ آگ کا استعمال کرتے تھے۔ نیزوں اور تیروں کی نوک پر دو کانٹے لوہے کے اور ایک حلقہ بناتے تھے جس پر نمدہ لپیٹ کر مشتعل مادہ سے تر کر دیتے تھے۔ اور حریف کی طرف پھینکتے تھے۔

دبابیں سے مراد وہ آہنی آلات ہیں جو گھوڑوں کے زین سے لگا دئے جاتے تھے اور ان کے ذریعہ سے مجادلہ کرتے تھے۔ ان کو پہلے عُمُد کہتے تھے۔ لیکن بعد کو دبابیں کہنے لگے۔ جس کا واحد دبوس ہے۔ ان میں بھی بعد کو آگ شامل کردی گئی تھی۔

خود اپنی حفاظت کے لئے وہ ایسے کپڑے تیار کرتے تھے۔ جو آگ کو قبول نہ کریں۔ ان کپڑوں میں نوشادر اور شب یمانی وغیرہ بعض ایسی چیزیں ملتے تھے کہ آگ کا اثر نہ ہوتا تھا۔ کشتیوں کی حفاظت کے لئے بھی اسی قسم کی اشیاء استعمال کرنے کا دستور تھا۔

سمرن و تسبیح پر تاریخی روشنی

(جناب ابو الہدیٰ محمد افضل صاحب۔ کراچی)

"دنیا میں تسبیح کا رواج کب سے ہوا۔ اور مسلمانوں نے اسے کس طرح اختیار کیا۔ براہِ کرم تاریخی نقطۂ نظر سے گفتگو فرمائیے۔

(نگار) خیال کیا جاتا تھا کہ سب سے پہلے جن لوگوں نے سمرن کا استعمال کیا۔ وہ تبت کے بودھ لوگ تھے۔ کیونکہ وہاں کے آثار سے بہ کثرت ایسے ڈورے دستیاب ہوئے ہیں۔ جن میں لکڑی، صندل اور سیپ کے دانے پروئے ہوئے ہیں، بعض میں جواہرات بھی دیکھے گئے۔ جن کی تعداد اکثر و بیشتر ۱۸۰ ہے۔ لیکن اب تحقیق جدید سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم مصریوں میں بھی اس کا رواج پایا جاتا تھا۔ اور مسیح کے بعد قرن اول میں قبطی رہبانوں نے مسیحیت میں اس کا رواج قائم کیا۔

مسیح کے عہد میں یہ چیز بالکل نہیں پائی جاتی تھی۔ کیونکہ انجیل میں کسی ایک جگہ بھی اس کا ذکر نہیں پایا جاتا۔

جرمنی کے مشہور عالم شیف ہرزج کا بیان ہے کہ نصاریٰ میں سب سے پہلے سمرن کا استعمال قبطی عیسائیوں نے کیا اور یہ زمانہ مسیح کے بعد پہلے قرن کا تھا۔ اس کے بعد تسبیح پر دعاؤں کے پڑھنے کا رواج سب سے پہلے مالادیوس اور سوزدمین نے قائم کیا۔ اسی سلسلہ میں رواج تسبیح کے لئے بہت سی روائتیں بھی پیدا کی گئیں۔ چنانچہ منجملہ ان کے ایک یہ بھی کہ پطرس

اور اس کی بیوی کو خواب میں جناب مریم نے ہدایت کی کہ وہ تسبیح کے رواج کو جاری کریں

تاریخ اسلامی کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں بالکل اس کا رواج نہ تھا۔ گولڈ زیہر کی تحقیق یہ ہے کہ عرب میں تیسری صدی ہجری سے پہلے تسبیح کا رواج نہیں ہوا۔ اور یہ رواج ان میں مصر سے آیا۔

ایک حدیث میں روایت کی جاتی ہے کہ رسول اللہ نے اپنی ایک بیوی کو تسبیح کے ذریعہ سے عمل استخارہ بتایا۔ لیکن یہ بالکل غیر موثق ہے۔ ایک اور حدیث ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز و دعا کے شمار کے لئے چھوٹے چھوٹے سنگریزوں کا استعمال رسول اللہ نے منع کیا۔ اور اس کے بجائے انگلیوں سے شمار کرنے کا طریقہ بتایا۔ اسی طرح یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک بار عبداللہ بن عمر نے دیکھا کہ لوگ شمار کے لئے سنگریزوں کا استعمال کرتے ہیں اور آپ نے اس حرکت سے باز رکھا۔

اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ ابتدا عہد اسلام میں شمار کے لئے سنگریزوں کا استعمال ہوتا تھا۔ لیکن جس چیز کا نام تسبیح یا سُمرن ہے وہ رائج نہیں ہوئی تھی۔

تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ دوسری صدی ہجری میں بیشک اس کا رواج ہو گیا تھا۔ لیکن خالص مذہبی نقطہ نظر سے اسے محمود طریقہ نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب ایک عباسی خلیفہ نے اپنی ماں کو جو امور سلطنت میں دخل دیتی تھی، نصیحت کی تو اس کے الفاظ یہ تھے کہ

"عورتوں کے لئے اُمورِ مملکت میں دخل دینا مناسب نہیں تم اپنا وقت نماز و استعمال تسبیح میں صرف کیا کرو۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت تسبیح کا رواج صرف عورتوں اور دنیاداروں میں پایا جاتا تھا۔

ایک بار لوگوں کو ابوالقاسم الجنید کے اسباب میں ایک تسبیح نظر آئی اور اُسے لے لینا چاہا، لیکن ابوالقاسم نے عذر کیا کہ

"میں یہ چیز کیسے دیدوں جبکہ وہ روزانہ مجھے خدا سے قریب کرتی رہتی ہے۔"

اِن واقعات سے دو نتیجے نکلتے ہیں ایک یہ کہ بعض متقی لوگ تسبیح کا استعمال کرتے تھے۔ اور فقہا اس کے خلاف تھے۔ ابوعبداللہ محمد الانباری نے اپنی کتاب المدخل میں بدعت کے طور پر اس کا ذکر کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ تسبیح کا استعمال لوگ زیادہ تر ذکر و شغل کے جلسوں میں کرتے تھے۔ اور اس سے فارغ ہونے کے بعد ایک خاص صندوق میں رکھ دیتے تھے ہر ذاکر و شاغل کو "شیخ السُبحۃ" کہتے تھے۔ اور اُن کے خدام "خادم السُبحۃ" کے نام سے موسوم ہوتے تھے۔

بہر حال اسلام کو تسبیح سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ اور نہ اُس نے کبھی عبادات کے ساتھ اس قسم کی چیزیں رائج کر کے طاعت کے صحیح مفہوم کو تباہ و برباد کیا

زمانۂ موجودہ میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس کے مذہبی لوگ تسبیح کا استعمال نہ کرتے ہوں۔ ایران، مصر، عرب، ہندوستان

روس، چین، جزائر جاوا وغیرہ ہر جگہ اس کا رواج ہے۔ اور اسقدر وہم کے ساتھ کہ لوگوں کو تسبیح دھو دھو کر شفاء مرض کے لئے پانی پلایا جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ سے عمل استخارہ کیا جاتا ہے اور اگر کسی درویش کے پاس یہ چیز نہ ہو تو اس کی ولایت و بزرگی ناقص ہے۔ حاجی لوگ جب حج سے واپس آتے ہیں، تو زمزم کے ساتھ خاک شفا کی تسبیح بھی ضرور لاتے ہیں۔ اور اعزہ و احباب میں تقسیم کرتے ہیں۔ لیکن یہ سب لغویات ہیں اور اسلام نے ہمیشہ ان باتوں سے بچنے کی تعلیم دی ہے، مگر اب لوگ حقیقی اسلام سے اسقدر بیگانہ ہو گئے ہیں کہ اگر ان کے سامنے اس قسم کی باتیں بیان کی جائیں تو وہ انھیں کلمات کو کفر پر محمول کریں گے۔ اور کہنے والے کو کافر و مرتد قرار دے دیں گے۔

کاجل ۔ سرمہ ۔ چورن ۔ منجن

ایڈیٹر صاحب نگار نے خود ان دواؤں کا اطمینان کر کے اپنی رائے ان کے مفید ہونے پر اکتوبر کے ملاحظات میں ظاہر کی ہے
دوسری تازہ سند ملاحظہ ہو:- سرمہ ضعف بصارت وغیرہ کے لیے بہت مفید ہوا۔ ایک شیشی اور بھیجدیجئے۔

(سید رضا، زیر سوبیٹھ) (ابوت محل)

کاجل آشوب، سرخی، ضعف بصارت کے لئے ازبس مفید ہے۔ ایک ڈبیہ جو ایک شخص کے لئے سال بھر کو کافی ہے قیمت ایک روپیہ عہ

سرمہ یہ بیش بہا سرمہ چالیس دن میں تیار ہوتا ہے اس میں نہ ممیرہ ہے نہ کوئی جواہر بلکہ معمولی سرمہ ہے جسکو جڑی بوٹی کے عرق میں بیس بار تیار کیا جاتا ہے اس کے فوائد کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جالا، دھند۔ موتیا بند۔ اور ضعف بصارت صرف ایک ماہ کے استعمال سے جاتا رہتا ہے اور بارہا آزمایا ہوا ہے قیمت فی پڑیا عہ، علاوہ محصول

چورن یہ وہ اکسیری چیز ہے جسکا ہر گھر میں رہنا ضروری ہے، پیٹ کا درد، قبض، نفخ ریاح کا پیدا ہونا، سوء ہضم دستوں کا آنا، سب یک لخت اس کے استعمال سے جاتا رہتا ہے کیسا ہی شدید درد پیٹ میں ہو ایک چٹکی کھا لینے سے جاتا رہتا ہے۔ قیمت فی ڈبیہ ۸ تولہ عہ، علاوہ محصول۔

منجن اسکی ادنیٰ خوبی یہ ہے کہ ہلتے ہوئے دانت جم جاتے ہیں قیمت فی ڈبیہ ۸ تولہ ایک روپیہ عہ، علاوہ محصول

نوٹ۔ سب چیزیں منگانے والوں کو محصول ڈاک معاف۔

م بیگم ذریعہ دفتر نگار لکھنؤ

فلکیات کے عجائب و غرائب

جب ۱۸۶۳ء میں مشہور ہیئت داں ہگنس نے اسپکٹر سکوپ (آلۂ تحلیل طیفی) کے ذریعہ سے ستاروں کی روشنی کے اجزا کئے تو اسی کے ساتھ اس کو یہ بھی معلوم ہوا کہ ستاروں کا درجۂ حرارت کیا ہے۔ اور فی مربع انچ کتنی حرارت ان سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ آفتاب کے درجۂ حرارت کے متعلق یہ تحقیق ہوئی کہ اس کی سطح کے ہر مربع انچ سے ایک منٹ میں اتنی حرارت پیدا ہوتی ہے کہ اس سے ...۳۶ کیلوگرام پانی کو جوش دیا جاسکتا ہے یا ۵ گھوڑوں کی قوت کا ایک انجن اس سے چل سکتا ہے۔ لیکن یہ واضح رہے کہ سطح آفتاب بہت زیادہ گرم نہیں ہے۔ بعض سیارے اسقدر گرم ہیں کہ ان کے ہر مربع انچ کی حرارت ایک منٹ میں ۳۶ کروڑ کیلوگرام پانی کو کھولا سکتی ہے۔

اس تحلیل طیفی سے جہاں اور فائدے ہوئے ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوا کہ ستاروں کا قطر اور ان کا حجم دریافت ہوگیا۔ یہ ریاضی کا مسئلہ ہے جس کی صراحت بیکار ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک ایسے سیارہ کا قطر دریافت ہوا، جو ہمارے سورج سے ۳۰۰ گنا بڑا ہے۔ اس سیارہ کا نام منکب الجوزا ہے۔ اور اس میں اتنی وسعت ہے کہ سورج ایسے ۹۰ لاکھ سیارے اس کے اندر سما سکتے ہیں اور ایک دوسرے سب سے چھوٹے سیارہ (التابع الشعری) کا قطر ون ۳۶ ہزار میل دریافت ہوا۔ ان دونوں سیاروں کا مادہ نہ تو بالکل شفاف ہے اور نہ جامد بلکہ آفتاب کی طرح درمیانی حالت میں ہے۔

وہ سیارے جو بہت زیادہ گرم ہیں ان کے مادہ کے متعلق یہ رائے قائم کی گئی ہے کہ وہ مرکب ہے برقپاروں اور نواۃ (ELECTRONS PROTONS) سے اور یہ برقپارے اور نواۃ دقائق گیس کی طرح انتہائی سرعت کے ساتھ حرکت کرتے ہیں۔ اور یہ سریع حرکت اس جذب کہربائی پر غالب آجاتی ہے جس سے جواہر فردہ ترکیب پاتے ہیں ۱۶۴۴ء میں ڈکارٹ نے یہ رائے ظاہر کی کہ آفتاب اور سیارے ایک ایسے مادہ سے مرکب ہیں جو نہایت تیزی سے گردش کر رہا ہے۔ اور جب وہ دوسرے اجسام سے ملتا ہے تو بے شمار نہایت ہی چھوٹے چھوٹے اجزا میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں یہ تحقیق ہوئی کہ آفتاب اور سیارے گیسی حالت میں ہیں۔

بعض ستارے زیادہ روشن نظر آتے ہیں اور بعض کم، لیکن یہ خیال درست نہیں کہ جو زیادہ روشن ہیں وہ زیادہ گرم ہیں۔ کیونکہ بعض نہایت گرم ستارے ایسے ہیں جو کم روشن ہیں جیسے قلب عقرب یا منکب الجوذا۔ اس کا تعلق زیادہ تر انکی عمر سے ہے یعنی جو ستارہ بہت پرانا ہے وہ کم روشن ہے اور جو حال کا ہے وہ زیادہ روشن ہے۔

علمی دنیا میں ناپ یا پیمائش کے لئے اس وقت دو طرح کے آلات موجود ہیں۔ ایک وہ جن سے بڑے اجسام یا بڑی مسافت کی پیمائش ہوتی ہے اور دوسری وہ جن سے چھوٹے اجسام یا کم مسافت کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ لیکن جب اجسام یا مسافت کی وسعت وتنگی حدود ریاضی سے گزر جاتی ہے تو پھر انسانی قیاس کا اضطراب دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔ مثلاً اگر ہم موج نور کو ناپنا چاہیں تو آلۂ سنتیمٹر کافی نہیں ہوتا کیونکہ موج نور اس سے بہت چھوٹی ہے۔ اس لئے علماء نے اس کے لئے ایک اور آلہ بنایا۔ جو ملیمیٹر سے ہزارواں حصہ چھوٹا ہے، اس کے بعد جب یہ دیکھا گیا کہ رانتجنی شعاعیں بہت زیادہ چھوٹی ہیں تو اس کے لئے پھر ایک آلہ ایجاد کیا گیا جو $\frac{۱}{۱۰۰۰۰۰۰۰۰}$ انچہ کے برابر ہے

اسی طرح اب اجسام اور بڑی مسافتوں کو دیکھئے کہ اس کی پیمائش کے لئے انچ، فٹ، گز اور میل وغیرہ ایجاد کئے گئے، لیکن جب فلکیات کے سلسلے میں ستاروں کی مسافتوں کی پیمائش کا سوال پیدا ہوا تو میل وغیرہ سب بیکار ہو کر رہ گئے۔ کیونکہ ہمارے نظام شمسی سے جو ستارہ قریب تر واقع ہوا ہے وہ زمین وآفتاب کے درمیانی فاصلہ سے تین سو ہزار گنا زیادہ دور ہماری زمین سے واقع ہے۔ اس لئے فلکیات میں مسافت کا اندازہ کرنے کے لئے "نوری سال" کی اصطلاح قائم ہوئی۔ یعنی ایک سیارے سے دوسرے سیارے تک روشنی کتنے عرصہ میں پہونچتی ہے۔ اب یہ سامنے رکھ کر کہ روشنی ایک سکنڈ میں ۱،۸۶،۳ امیل کا سفر کرتی ہے۔ فلکیات کے عجائب اور کائنات کی وسعت کا اندازہ کیجئے کہ زمین سے جو ستارہ قریب تر واقع ہے۔ اس کی روشنی ساڑھے تین سال میں زمین تک پہونچتی ہے۔ دوسرا ستارہ شعریٰ ہے۔ جس کی روشنی ۱۰ سال میں پہونچتی ہے، قطب تارہ کی روشنی ۲۰۰ سال میں اور سدیم الجبار کی ۵۰۰ سال میں پہونچتی ہے۔

اگر ہم آفتاب کو مرکز قرار دے کر اس کے چاروں طرف کی فضا کو ایک ہزار نوری سال کے برابر وسیع کرلیں تو اس کے معنے صرف یہ ہوں گے کہ ہم نے اس فضا میں صرف ان ستاروں کو شامل کیا ہے جو بغیر دوربین کی مدد سے آنکھ سے نظر آتے ہیں۔ اور اگر ہم اس فضا کو ۲۵ ہزار نوری سال کے برابر وسیع مان لیں۔ تو ہم زیادہ سے زیادہ کہکشاں تک کا احاطہ کرسکیں گے۔ لیکن کائنات اس جگہ ختم نہیں ہوجاتی۔ بلکہ اس کی وسیع فضا میں خدا جانے کتنے اور نظام ہماری کہکشاں سے بہت زیادہ وسیع پائے جاتے ہیں جن کی روشنی لاکھوں سال میں بھی ہم تک نہیں پہونچتی۔ پھر ظاہر ہے کہ ان مسافتوں کی پیمائش کے لئے نوری سال بھی کافی نہیں

ہوسکتا ـ مثلاً مجلاّنی ہی کو لیجئے کہ وہ ہم سے ایک لاکھ نوری سال کے فصل پر واقع ہے، یا ستاروں کے اُن مجموعہ کو لیجئے، جو N. G. C. کے نام سے مشہور ہیں کہ ان کی روشنی سات لاکھ سال میں پہونچتی ہے ـ اور سدیم لولبی کی روشنی ۱۰ لاکھ سال میں بھی نہیں پہونچتی ـ

"المراۃ المسلسلۃ" کے سدیم کے متعلق علمار کی تحقیق یہ ہے کہ وہ ہم سے ۱۰ لاکھ نوری سال کے فاصلہ پر واقع ہے اور اس کا قطر ۵۰ ہزار نوری سال کا ہے ـ اس کے اندر کروروں ستارے ایسے ہیں جو ہمکو نظر ہی نہیں آتے اور جو نظر آتے ہیں وہ ہمارے آفتاب سے ہزاروں گنا بڑے اور زیادہ روشن ہیں ـ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر ہم آفتاب کو ۱۰ لاکھ نوری سال کے فاصلہ پر لے جائیں تو ہم اس کی تصویر نہیں لے سکتے، لیکن ان ستاروں کی تصویر فوٹو گراف کے ذریعہ آجاتی ہے ـ اس سلسلہ میں بعض ایسے ستارے دریافت ہوئے ہیں جو ہمارے آفتاب سے ۱۰ کرور گنا زیادہ روشن ہیں ـ اور جب ان کی روشنی انتہائی کمی پر ہوتی ہے تو اُن سے ہر سکنڈ میں ۲۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ ٹن مادہ نکل کر فضا میں منتشر ہوتا رہتا ہے ـ

ہمارا کرۂ زمین جو ۲۴ ہزار میل کے دَور میں ہے بظاہر بہت بڑا معلوم ہوتا ہے لیکن آفتاب کے مقابلہ میں اسکی کیا حقیقت ہے اس کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اگر آفتاب کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے اس سے زمین کے برابر بہت سے کرے تیار کئے جائیں تو اُن کی تعداد ۳۲۳۴۳ ہوگی ـ

لیکن یہ آفتاب بھی باوجود اس قدر عظمت کے کائنات میں وہی حیثیت رکھتا ہے ـ جیسے کسی بڑے فانوس کے اندر کوئی مکھی ـــ

عریاں آنکھ سے ہم کو صرف ۶۰۰۰ تارے نظر آتے ہیں لیکن دُوربین کے مدد سے ۲۲ کرور ۴۰ لاکھ تارے تصویر میں آجاتے ہیں ـ اور یہ سب کے سب وہی تارے ہیں جو ہماری کہکشاں سے متعلق ہیں، لیکن باوجود اس قدر کثرت کے ایک کا فصل دوسرے سے اتنا ہے کہ اگر ہم دس مکھیاں یوروپ میں چھوڑ دیں، دس ایشیا میں اور دس افریقہ میں تو انکا فصل ایک دوسرے سے کم، ہوگا ـ بہ نسبت اُس فصل کے جو ان کروروں ستاروں کے درمیان باہم پایا جاتا ہے ـ

ڈاکٹر ہبل نے اپنی بڑی دُوربین کے ذریعہ سے جس کے شیشہ کا قطر ۱۰۰ انچ کا ہے جو تصویر لی ہے ـ اِس سے ۲۰ لاکھ ایسے سدیم معلوم ہوئے ہیں جو ۱۴ کرور نوری سال کے فاصلہ پر ہم سے واقع ہیں ـ اور خود ان کے درمیان باہم

۱۸۔ لاکھ نوری سال کا فصل پایا جاتا ہے۔

ہر سدیم کے اندر اتنا مادہ پایا جاتا ہے کہ اس سے ہمارے آفتاب کے ایسے لاکھوں آفتاب تیار ہو سکتے ہیں

سمن بغرض انفصال مقدمہ

(آرڈر ۵ قواعد ۱ و ۵ مجموعہ ضابطہ دیوانی سنہ ۱۹۰۸ء)

نمبر مقدمہ ۵/ج

بعدالت مال جناب بابو ماتا پرشاد صاحب سنہا　　مقام بھونگام　　ضلع مین پوری

آنریری اسسٹنٹ کلکٹر بہادر

ڈونڈہ درگا پرشاد ، مدعی

بنام

حامد علی

ہر دیال سنگہ وغیرہ　　مدعا علیہ

بنام ہر دیال سنگہ ولد برج لعل و مسماۃ منتہنا بیوہ پتو ۔۔۔ باجی لال ولد رام سہائے و مہیت ولد دیو جیت قوم اہیر ساکن موضع نوادہ پرگنہ و تحصیل بھونگام ضلع مین پوری

واضح ہو کہ ——— مدعی نے تمہارے نام ایک نالش بابت بقایا آب پاشی کے دائر کی ہے لہٰذا تمکو حکم ہوتا ہے کہ تم بتاریخ ۱۰ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ء بوقت دس بجے دن بمقام بھونگام اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کیحالت سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہے اور جو کل امور اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جس کے ساتھ کوئی اور شخص ہو کہ جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہو اور جوابدہی دعویٰ کی کرو اور ہرگاہ وہی تاریخ جو تمہاری حاضری کیلئے مقرر ہی واسطے انفصال قطعی مقدمہ کے تجویز ہوئی ہے پس تمکو لازم ہے کہ اوسی روز اپنے جملہ گواہوں کو جنکی شہادت پر نیز جملہ دستاویزات جن پر تم بتائید اپنے جوابدہی کے استعمال کرنا چاہتے ہو پیش کرو۔

اور تم کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اگر بروز مذکور تم حاضر نہ ہو سکے تو مقدمہ بغیر حاضری تمہارے مسموع اور فیصل ہوگا۔

یہ تحت میں دستخط اور مہر عدالت کے آج بتاریخ ۱۵ ماہ اگست سنہ ۱۹۳۱ء جاری کیا گیا

(دستخط)

مہر عدالت

سید حامد علی پیشکار
اسسٹنٹ کلکٹر درجہ دوم

آیندہ جنوری ۱۹۳۲ء کا نگار

تقریباً دو سو ۲۰۰ صفحات پر شایع ہوگا

اور

مخصوص ہوگا **مطائبات غالب** کے لئے۔ اسوقت تک غالب پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اسکی فلسفہ طرازی، معنی آفرینی علوِ خیال، بلندیِ مفہوم اور دشوار پسندی سے متعلق تھا لیکن یہ راز ابتک سربستہ ہے کہ غالب کی شہرت و کامیابی کا حقیقی راز ان سب سے علحدہ صرف اسکی شوخی، شوخ نگاری، بذلہ سنجی اور مطائبات پسندی میں پنہاں ہے جنھوں نے اسکے سارے کلام کو خواہ وہ نظم ہو یا نثر، فارسی ہو یا اردو ایک نہایت ہی اچھوتی قسم کی تنقید ملیح WITTY CRITICISM میں تبدیل کر دیا ہے

یہ مضمون ایک مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے جسمیں برسوں کی محنت و کاوش کے بعد اسکے اردو کلام سے اسکی فارسی تصانیف سے اسکے رقعات سے اور تمام ان واقعات وحالات سے جو تذکروں اور خود اسکی تصانیف میں ملتے ہیں غالب کی شوخی و شوخ نگاری پر تمام پہلوؤں سے نہایت ہی مکمل بحث کیگئی ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ غالب کی شہرت و کامیابی کا تنہا راز صرف یہ تھا کہ وہ قدرت کی طرف سے نہایت شوخ و بذلہ سنج طبیعت لیکر آیا تھا۔ اور اسکی ساری زندگی اس کی جملہ تصانیف میں یہی وہ رنگ ہے جو تمام شعراء سے اسے ممتاز بناتا ہے۔

سب سے پہلے ایک بسیط مقدمہ کے ذریعہ سے مثالیں دیدیکر بتایا جائیگا۔ کہ شوخی و ظرافت کی دنیا میں کتنی قسمیں ہیں۔ غالب سے قبل کن کن شعراء نے اسے اختیار کیا۔ ہندوستان میں اس رنگ نے کتنا عروج اختیار کیا اور پھر غالب کے اردو فارسی کلام اور اس کے حالات و کوائفِ زندگی کا استقصاء کرکے بتایا جائیگا کہ غالب حقیقتاً کسقدر دلچسپ انسان تھا۔ اور کیسے کیسے نوادر ادب اور لطائف انشاء وہ اپنے بعد چھوڑ گیا۔

یہ کتاب اگر ایک طرف فن تنقید کی بہترین مثال ہے تو دوسری طرف ایسا مجموعہ لطف ہے کہ شاید ہی اس سے بہتر ذریعہ تفریح و دلچسپی کا کوئی اور ہو۔ یہ تصنیف غالب کے متعلق بالکل اچھوتی چیز ہوگی اور ہر شخص کے ذوق کو آسودہ کرنیوالی۔ وہ حضرات جو غالب کا صحیح مطالعہ کرنا چاہتے ہیں انکے لئے اس کتاب کا دیکھنا ایک فریضۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کتاب صرف نگار کے جنوری نمبر میں شائع ہوگی اور اسلئے اسکے حاصل کرنیکا تنہا ذریعہ یہی ہے کہ نگار کی خریداری کو جاری رکھیئے اور آپکے حلقۂ احباب میں جو حضرات اس کتاب کو حاصل کرنا چاہتے انھیں نگار کی خریداری پر آمادہ کیجئے۔

اسی کے ساتھ غالب کی ایک رنگین تصویر بھی ہوگی جو اس سے قبل کہیں شایع نہیں ہوئی۔

نیاز

"سرورِ کونین"

وہ دیکھ! فضائے ہستی میں انوار کا اک طوفاں اٹھا
لو حسن کی بارش ہونے لگی، وہ ابرِ ضیا افشاں اُٹھا

ساقی نے سجائے جام و سبو، بادل اُمڈے کلیاں چٹکیں
اک شورِ صلائے عام، سرِ صہباکدۂ عرفاں اُٹھا

شب ختم ہوئی، تارے ڈوبے، گردوں کے دریچے کھلنے لگے
پیغامِ طرب دینے کے لئے، پیکِ سحرِ خنداں اُٹھا

تصویرِ حیاتِ فانی سے باطل کی سیاہی دھونے کو
سامانِ طرازِ روح لئے، نقاشِ مہِ تاباں اُٹھا

آئیں، وہ تلاشِ حسنِ ازل کا سوز ہے جنکے سینوں میں
اس بزم میں جو مضطر آیا وہ تفتہ جگر شاداں اُٹھا

بیدار ہے رُوحِ آسائش، اب بزمِ جہاں نورانی ہے
وہ دَورِ شبِ آرا ختم ہوا وہ صبر شکن ساماں اُٹھا

ہر فتنہ گرِ محرومِ یقیں کا خرمنِ ہستی جلنے لگا
اِک برق سی چمکی پیشِ نظر، اِک شعلہ سرِ داماں اُٹھا

بکھرے ہیں ہزاروں مہر مبیں، ہے محوِ تحسّر چرخِ بریں
پردہ تھا جو تیرے جلوؤں پر اے انجمنِ امکاں اُٹھا

مٹتی ہے دلوں کی بے چینی، پیغامِ طرب کے آتے ہیں
چلتی ہے نسیمِ روح فزا، اب غنچے کھِلتے جاتے ہیں

اے دہر مبارک ہو تجھکو فردوسِ طرب کی جلوہ گری
پھولوں کا تبسم، حسنِ فضا، نغموں کا تلاطم، رقصِ پری

چلتی ہے نسیمِ امن واماں، آسودہ ہے ریگستانِ عرب
دم توڑ رہی ہے خود بینی، خاموش ہے نبضِ فتنہ گری

اقبالِ ظفر مندی نے الٹ دی، بڑھ کے بساطِ ناکامی
احساسِ جواں سالی میں ہوا تبدیل غمِ پیرانہ سری

تکمیلِ حقیقت نے بخشا، غفلت کو شعورِ بیداری
تعمیرِ صداقت نے پایا، خطرات میں درسِ بے خطری

تذلیلِ غلامی نے پائی توفیقِ کمالِ آزادی
گم کردہ رہی نے روشن کی قندیلِ مقامِ راہبری

تنظیمِ کرم پر ختم ہوئی، افکارِ جفا کی خوں ریزی
تعلیمِ خرد میں صرف ہوئی اربابِ جنوں کی جامہ دری

اے کون ومکاں کے رازِ شرف! اے بادشہِ دین و دنیا
روشن ہے تری ذاتِ عالی سے انجمنِ اوجِ بشری

کافی ہے اسے نسبت، تجھ سے کچھ اور نہو گھر دُنیا میں
اے کاش زمانہ کر سکتا، احساسِ حبابِ کم نظری

رخشاں ہے تجلّی سے تیری تاریک زمیں کی پیشانی
عنوان ہے تیری ہستی کا تکمیلِ حیاتِ انسانی

آقا! یہ وہی خدام ہیں جنکا فخر ہے قرباں ہو جانا
نقشِ قدمِ ایمان ویقیں پر مٹ کے نمایاں ہو جانا

ادبار نے لیکن چھین لیا ہے، حوصلۂ احساسِ عمل
آلام ہیں، جوشِ عبرت ہے، اور سر بگریباں ہو جانا

وہ بادِ سحر کی نرم روی سے آج لرزنے لگتے ہیں
جانا تھا نہ جن غنچوں نے کبھی، صرصر سے پریشاں ہو جانا

امواج کی ہلکی سی جنبش سے آج وہ گھبرا جاتے ہیں
مانا تھا نہ جن مردوں نے کبھی، آسودۂ طوفاں ہو جانا

وہ آج پڑے ہیں سہمے ہوئے غفلت کے اندھیرے غاروں میں
سیکھا تھا نہ جن شیروں نے کبھی، پابندِ نیستاں ہو جانا

دُنیا کو جنھوں نے سمجھائے اسرارِ حیاتِ بیداری
وہ ہوش ورانِ عالم ہیں اور صرف شبستاں ہو جانا

ہر خون کے قطرے میں جنکے اک حشرِ صداقت برپا تھا
اللہ انھیں سربازوں کا خود دشمنِ ایماں ہو جانا

بجلی کی چمک تھی، چند نفس یا رقصِ شرر کا عالم تھا
جلوؤں کا نمایاں ہونا پھر اس رنگ سے پنہاں ہو جانا

وہ زلزلہ افگن جوش نہ اب وہ زورِ شجاعت باقی ہے
سینے تو وہی ہیں لیکن اک ٹوٹی ہوئی ہمت باقی ہے

ہر چند کہ اپنی حالت کے اظہار سے ہم شرماتے ہیں
عصیاں کے نتائج سہتے ہیں، غفلت کی سزائیں پاتے ہیں

ہم شکوۂ جورِ گردشِ دوراں، آہ، مگر کس مُنہ سے کریں
کرتے ہیں بپا خود بزمِ ستم، خود زخم جگر پر کھاتے ہیں

افعال وہ ہیں توحید شکن، اصنام کو جن پر عبرت ہو
اعمال وہ ہیں، بیگانۂ دیں، شیطان کو جو شرماتے ہیں

عقل اپنی غلط آگاہی سے الحاد کی جانب بڑھتی ہے
دل آرزوے حق طلبی میں انکار سے تسکین پاتے ہیں

طوفان ہوا خاموش مگر ابتک ہے فضا میں گونج وہی
شب ختم ہوئی، لیکن اب بھی ظلمت کے علم لہراتے ہیں

آقا! یہ نہیں ہے گرچہ غلط، ہم رہنِ قصور و عصیاں ہیں
مشہور ہی لیکن آپ گنہ گاروں پہ کرم فرماتے ہیں

ہر چند کہ اس نسبت کیلئے لازم ہیں صفاتِ عالی بھی
سرکار! زمیں کے ہر گوشہ پر آپ ہی کے کہلاتے ہیں

اسلام کی عظمت ہم سے نہیں لیکن یہ شرف باقی ہے ابھی
ہم نامِ مبارک پر اب بھی سو جان سے فدا ہو جاتے ہیں

فریاد ہے اے کونین کے سرور! وقت جانفرسا کب تک
خدامِ حضورِ عالی پر آخر ستمِ دُنیا کب تک

علی اختر (از حیدر آباد دکن)

سمن بغرض انفصال مقدمہ

نمبر مقدمہ ی ۲۲
(آرڈر ۵ قواعد ۱ و ۵ مجموعۂ ضابطہ دیوانی سنہ ۱۹۰۸ء)

بعدالت اجلاس جناب بابو ماتا پرشاد صاحب سنہا آنریری اسسٹنٹ کلکٹر بہادر مقام بھونگام ضلع مین پوری

دوبے سونی لال مدعی

بنام

بنام بدھو و رامدیال و کھانسہا پسران ارجن اقوام اہیر ساکن موضع نگلہ متدکر عرف نگلہ گوٹھی پرگنہ و تحصیل بھونگام ضلع مینپوری بدھو وغیرہ مدعا علیہ

واضح ہو کہ ——— مدعی نے تمہارے نام ایک نالش بابت بقایا لگان کے دائر کی ہے لہذا تمکو حکم ہوتا ہے کہ تم بتاریخ ۱۰ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ء بوقت دس بجے دن بمقام بھونگام اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کی حالت سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور جو کل امور اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دیسکے یا جسکے ساتھ کوئی اور شخص ہو کہ جواب ایسے سوالات کا دیسکے حاضر ہو اور جوابدہی دعویٰ کی کرو اور ہرگاہ وہی تاریخ جو تمہاری حاضری کیلئے مقرر ہے واسطے انفصال قطعی مقدمہ کی تجویز ہوئی ہے پس تمکو لازم ہے کہ اُسی روز اپنے جملہ گواہوں کو جنکی شہادت پر نیز جملہ دستاویزات جن پر تم بتائید اپنے جوابدہی کے استعمال کرنا چاہتے ہو پیش کرو۔ اور تمکو اطلاع دیجاتی ہے کہ اگر بروز مذکور تم حاضر نہو گے تو مقدمہ بغیر حاضری تمہارے مسموع اور فیصل ہوگا۔ یہ تحت میں دستخط اور مہر عدالت کے آج بتاریخ ۱۵ ماہ اگست سنہ ۱۹۳۱ء جاری کیا گیا۔

(دستخط) سید حامد علی پیشکار

اسسٹنٹ کلکٹر درجہ دوم

مُہر عدالت

دہقانی لڑکی

(۱)

اُجلا نکھرا چاند کا ٹکڑا　　بھولا بھٹکا صبح کا تارا
فطرت کا وارستہ جلوہ　　شبنم کا آوارہ قطرہ
حُسنِ مجسّم، پیکرِ زہرا　　گاؤں کی ملکہ ۔ دُخترِ صحرا

(۲)

کانٹوں میں اِک پھُول کھلا ہے　　سارا جنگل مہک رہا ہے
دُنیا اُلٹی گھُوم رہی ہے　　پتی پتی جھوم رہی ہے
بیخود ہیں خاموش فضائیں　　وجد میں ہیں مدہوش ہوائیں
لوٹ رہی ہے ہوش کی دنیا
گاؤں کی ملکہ ۔ دُخترِ صحرا

(۳)

بے ترتیب پریشاں گیسو	اوڑھنی رشکِ رم آہو
بھری بھری بلوریں باہیں	تیز تیز بیباک نگاہیں ،
لالہ رُخ، طاؤسی گردن	بھولی صورت، سادی چتون

جوہی کا نورستہ غنچہ!
گاؤں کی ملکہ ۔ دُخترِ صحرا

(۴)

جامن کی اک شاخ جھکائے	چہرے کو پتوں میں چھپائے
گالوں کو خوشوں سے لگائے	رستے والوں سے شرمائے
زانو پر اک پاؤں اُٹھائے	یوں خود کو "تصویر" بنائے

دیکھ رہی ہے رستہ چلتا
گاؤں کی ملکہ ۔ دُخترِ صحرا

(۵)

پیروں میں کیکر کے بچھوے	کانوں میں سینکوں کے بالے
زیبِ گلو کنول کی مالا	آنکھ میں کاجل کا دُنبالا
سیدھے تیر چلانے والی	ہرنی کو شرمانے والی

فخرِ بیاباں، "عالم آرا" ، گاؤں کی ملکہ ۔ دُخترِ صحرا

(طالب باغپتی)

حضرت نیاز فتحپوری کی ڈائری

مذاکراتِ نیاز

جو ادبی جواہر پاروں کا بیمثل خزینہ ہی۔ جسکا ایک ایک فقرہ انشاء عالیہ کا لاجواب نمونہ ہی۔ جسمیں نزاکت خیال، ندرت بیان اور حسن ادا کی ایسی ایسی مکمل مثالیں موجود ہیں کہ کسی دوسری جگہ آپکو مل ہی نہیں سکتیں۔ معہ محصول ایکروپیہ میں وی پی روانہ ہوگا۔ خود منگائیے اور اپنے احبابکو بھی متوجہ کیجئے۔

نقاب اٹھ جانیکے بعد حضرت نیاز کے اُن افسانوں کا مجموعہ جنمیں بتایا گیا ہی کہ ہر وہ چیز جو چمکتی ہی سونا نہیں۔ فاضل ادیب کا مخصوص انداز تحریر اور زور قلم ان افسانوں میں بدرجہ کمال نظر آتا ہی، جا بجا وہ مزاحیہ رنگ جو جناب نیاز کی تحریر کی خصوصیت ہے عجیب لطف دیتا ہے۔ قیمت معہ محصول ۸ر

لالۂ رُخ طامس مُور کی اس مشہور عالم مثنوی کا ترجمہ نگار کے سال اوّل میں بالاقساط شائع ہو کر جتنی قبولیت حاصل کر چکا ہی کسی سے مخفی نہیں۔ ایک تو مصنف کی نزاکت خیال اور اُسپر ملک کے ادیب جلیل جناب لطیف احمد اکبر آبادی کا ترجمہ، جتنی بھی تعریف کیجائے کم ہی۔ اس کتاب میں چار افسانے ہیں (۱) ابن مقنع (۲) بہشت اور پری (۳) آتش پرستان فارس (۴) نور محل۔ اور ہر افسانہ اپنی جگہ شاعرانہ نزاکت خیال کی آخری حد ہی۔ قیمت معہ محصول عہ

دو تبسم یعنی جناب شوکت تھانوی مشہور مزاحیہ نگار کے مجموعۂ مضامین کی دونوں جلدیں۔ موج تبسم۔ اور بحر تبسم اگر آپ نے ابھی تک نہیں دیکھیں تو افسوس ہے کہ اسوقت تک آپنے اپنی زندگی کی بہت سی مسرور ساعتیں ضائع کر دیں۔ موج تبسم مجلد علاوہ محصول عا۔ بحر تبسم غیر مجلد علاوہ محصول عہ

تذکرۂ خندۂ گُل یعنی اُردو فارسی کے تمام ظریف شاعروں کے حالات، اُن کے لطائف و ظرائف اور اُن کے ظریفانہ کلام کا بہترین انتخاب صرف چند جلدیں باقی ہیں۔ قیمت معہ محصول ۱ے

فراست التحریر یعنی ایک شخص کی اردو انگریزی تحریر اور اس کے دستخط کو دیکھ کر اسکی مزاجی حالت، اسکی سیرت، چال چلن، اور اس کے مستقبل پر حکم لگانے کا فن۔ اُردو میں اس فن پر بالکل پہلی کتاب۔ انگریزی اور اُردو دونوں خطوں اور دستخطوں کے نمونے بھی آسانی کے لئے دیدیے گئے ہیں۔ قیمت معہ محصول عہ

نگارستان (دوسرا اڈیشن) حضرت نیاز کے اور متعدد مضامین اور افسانے شامل کئے گئے ہیں۔ نگارستان نے ملک میں جو درجہ مقبولیت حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کیے گئے۔ قیمت عہ

گہوارۂ تمدن (دوسرا اڈیشن) مولانا نیاز کی وہ معرکتہ الآرا کتاب جس میں تاریخ اور اساطیر سے ثابت کیا گیا ہے کہ ارتقاء تمدن میں عورت نے کتنا زبردست حصّہ لیا ہے۔ اور دنیا کی تہذیب و شائستگی اس کی کسقدر ممنون ہے۔ اُردو میں بالکل پہلی کتاب ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

شہاب کی سرگزشت حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہی۔ اس زبان کی اس کی تخییل اسکی نزاکت بیان، اسکی بلندی مضمون اور اسکی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے۔ قیمت علاوہ محصول عہ

مینیجر رسالہ نگار لکھنؤ

سیلِ جذبات

اجل تو اک اتفاق ہی، اتفاق کا کچھ گلا نہیں ہے
وگرنہ جو ذی حیات ہیں اُن کی جستجو کو فنا نہیں ہے

بجھے ہوئے دلمیں آرزوؤں کی روشنی سرد ہو چکی ہے
معاف کر، ای نوازشِ دوست اب کوئی مدعا نہیں ہے

یہ محشرِ رنج و غم، یہ مجبوریاں، یہ حالاتِ صبر پیما
حیات کیونکر بسر ہوئی جا رہی ہی کوئی پتا نہیں ہے

حوادثِ روزگار دیکھیں ابھی دکھاتے ہیں اور کیا کیا
ابھی تو اتنا سمجھ میں آیا ہے بیکسوں کا خدا نہیں ہے

یہ محفلِ کائنات کیا ہی، یہ شور کیا ہے، یہ بات کیا ہی
فنا یہاں مستقل نہیں ہی بقا یہاں دیر پا نہیں ہے

وہ دل جہاں محوِ خواب تھیں قہقہوں کی راحت فزا نوائیں
فغاں! کہ اُس دلمیں کچھ بھی اب غیر نالۂ جانگزا نہیں ہے

اٹھا ای دلِ خستہ اپنی رگ رگ میں برقِ قوت کو مرتعش کر
سوائے اپنے جہاں میں کوئی کسی کا مشکلکشا نہیں ہے

وہ دل تو اب بجھ چکا ہے، ترے نثار، اک اور دل بنا دے
ترے لئے دل بنانیوالے یہ جنس کچھ بے بہا نہیں ہے

یہ نشۂ قوتِ عمل ہے کہ سرکشی کی نوازشیں ہیں
دعا سے یوں بے نیاز ہی دل کہ جیسے دستِ دعا نہیں ہے

عدم

حسن کا عروج

تھا حسن بے بس خود دام بن کر
وہ جعدِ مشکین زلف خمیں
اب حسن مائل پرواز پر ہے
کوتاہ دامن گیسو بُریں

افسر میرٹھی

نگار بُک ایجنسی کی زیر طبع کتابیں

چند گھنٹے فلاسفۂ قدیم کے ساتھ اسمیں نہایت ہی دلکش انداز بیان کیساتھ انسانی سوسائٹی کے نظام، دنیا کے امن و سکون، ہیئت اجتماعی کے اصول پر بالکل فسانہ کی زبان میں بحث کیگئی ہے اور ہر اُس شخص کو جو موجودہ مسائل ہند سے دلچسپی رکھتا ہے اسکا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ یہ تالیف بھی حضرت نیاز فتحپوری کی ہے۔

مادئین کا مذہب اسوقت ہر شخص کی زبان پر مادہ اور مادہ پرستی کے الفاظ چڑھے ہوئے ہیں، لیکن آپکو اس کتاب کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوسکے گا۔ کہ مادئین کا مسلک و مذہب کیا ہے اور وہ کس نگاہ سے عالم کو دیکھتے ہیں۔ اس کتاب کا طرز ادا اسقدر آسان و دلکش ہے کہ ایکبار شروع کرنا گویا ختم کر دینا ہے۔ یہ بھی جناب نیاز فتحپوری کے فکر و دماغ کا نتیجہ ہے۔

گہنا اور دوسرے افسانے حضرت مجنوں گورکھپوری کے بہترین افسانوں کا مجموعہ۔ جناب مجنوں کی افسانہ نگاری ایک مخصوص دلکش انداز کی ہوتی ہے۔ جس سے ناظرین نگار بخوبی واقف ہیں۔ یہ مجموعہ ۳۰۰ صفحات سے زائد کا ہے۔

منیجر نگار

مولانا شبلی

سیرۃ النبی جلد اول — عمہ
" دوم — صہ
" سوم — ممہ
الفاروق — عہ و ے
سیرۃ النعمان — عمہ
الغزالی — عمہ
المامون — عمہ
سوانح مولانا روم — عمہ
سفرنامہ مصر و شام — عمہ و عہ
علم الکلام — عمہ و عہ
الکلام — عمہ و عہ
رسائل شبلی — عمہ
مقالات شبلی — عہ
شعر العجم جلد اول — ۱۲؍ع
" دوم — ۸؍ع
" سوم — ۸؍ع
" چہارم — ۸؍ع
" پنجم — ۱۲؍عہ
موازنۂ انیس و دبیر — ے
مضامین عالمگیر — عہ و ۱۲؍
آغاز اسلام — ۱۲؍ و ۸؍
کلیات فارسی شبلی — ع
کلام شبلی اردو — عہ

رتن ناتھ سرشار

سیر کہسار — ے
خدائی فوجدار — ع
جام سرشار — ع
الف لیلہ بطرز ناول — صہ
کامنی — عہ

سوانح عمری عیار — ۸؍

منشی سجاد حسین مرحوم

احمق الذی — ۸؍
حاجی بغلول — ۸؍
پیاری دنیا — ۸؍
کایا پلٹ — ۸؍
میٹھی چھری — ۶؍
طرحدار لونڈی — عہ
طلسمی فانوس — ۱۲؍عہ

جوالا پرشاد برق

مرزا لنی — ۱۰؍
مار آستین — ۱۰؍
بنگالی دولہن — ۱۲؍
معشوقۂ فرنگ — ۸؍
پرتاب — ۱۲؍
روہنی

مولانا شرر مرحوم

جنید بغدادی — عہ
ملکہ زنوبیہ — ۳؍
قرۃ العین — ۳؍
مقدس رات — ۸؍عہ
جویائے حق — للعہ
نعمت چین — عہ
فاتح و مفتوح — عہ
بابک خرمی — ۸؍عہ
الفانسو — ۱۲؍
ایام عرب — ۸؍ع
قیس و لبنیٰ — عہ
یوسف و نجمہ — ۸؍عہ
زوال بغداد — عہ

مینا بازار — عہ
مقدس نازنین — ۸؍عہ
رومۃ الکبریٰ — عہ
فلپانا — ۸؍عہ
شوقین ملکہ — ۸؍عہ
منصور موہنا — ۸؍
حسن انجلینا — ۸؍
ملک العزیز ورجنا — ۱۲؍
فردوس بریں — ۸؍
حسن کا ڈاکو — ۸؍عہ
دربار حرام پور — ۱۰؍
غیب دان دولہن — عہ
بدر النساء کی مصیبت — ۴؍
میوۂ تلخ — ۸؍
نیکی کا پھل — عہ

شوق قدوائی

ترانۂ شوق — عہ
قاسم و زہرہ — ۱۲؍ و عہ
نیرنگ جمال — ۴؍

ظفر عمر بی اے

چوروں کا کلب — ۹؍
نیلی چھتری — عہ
بہرام کی گرفتاری — عہ

دلچسپ تاریخی و جاسوسی ناول

شعلۂ رنگیں — ۸؍
محاصرۂ پیرس — عہ
شیخ چلی — عہ
بہرام کی واپسی — ۴؍
انقلاب فرانس — عہ
حسن بنارس — ۸؍

فطرتی جاسوس — ۸؍عہ
ترکی حرم سرا — ۸؍
جنگ طرابلس — ۸؍
بہرام چور — ۸؍عہ
زر پرست — عہ
کنجی کا راز — ۸؍عہ
عبد الرحمن ناصر — عہ
عروس مصر — ع
سیلاب خون — ۸؍عہ
سیاحت زمین — عہ
سیاحت ہوا — عہ
نازنین مراکش — ۸؍
سمندر کی سیر — ۸؍ع
اسرار بالشویزم — عہ
مرزا رومیلی — ے
امین بک — عہ
حجاج بن یوسف — عہ
یوسف پاشا — عہ
انقلاب عثمانی — عہ
بہرام کی رہائی — عہ
بہرام کی آزادی — ۱۲؍
بہرام کی سرگزشت — عہ
لال گھوڑا — ۸؍عہ
پر اسرار قتل — ع

ادبی کتابیں

مکمل شرح دیوان غالب — ے
بزم خیال — عہ
مشاطۂ سخن — عہ
انشائے نسواں — ۶؍
مکاتیب محسن الملک — ۸؍عہ

لیلیٰ مجنوں ڈراما — ۸؍

مراثی

مراثی دبیر — ۸؍ع
مراثی انیس — للعہ
مراثی ضمیر — عہ
مراثی مونس — ۱۲؍ے
مراثی دلگیر — ۱۲؍ے

تذکرۃ الشعراء

تذکرۂ حسینی — ۱۱؍
گلشن — ۱۰؍
سراپائے سخن — عہ
سوانح نظیر اکبر آبادی — عہ

دواوین فارسی

دیوان شمس تبریز — ۱۲؍عہ
کلیات عراقی — ۱۲؍
دیوان حافظ — ۸؍عہ
دیوان بیدل — ۸؍
دیوان عرفی — ۱۲؍
کلیات جامی — ۸؍عہ
کلیات غالب — ۸؍عہ
کلیات صائب — ۱۲؍عہ
دیوان ناصر علی — ۶؍
کلیات سعدی — ۸؍عہ
کلیات حزیں — ۱۲؍ع
دیوان عنصری — ۱۴؍
دیوان غنی کشمیری — ۶؍
دیوان ہلالی — ۶؍

دواوین اردو

کلیات ظفر — ۱۲؍ع
کلیات مومن — عہ

دیوان ناسخ — عہ
کلیات میر — ۸؍عہ
کلیات سودا — ۸؍عہ
کلیات انشا — ۸؍عہ
کلیات نظیر اکبر آبادی — عہ
گلزار داغ — عہ
دیوان رند — ۹؍
دیوان ذوق — ۱۲؍
کلیات اسمٰعیل — ع
مرآۃ الغیب — عہ
صنمخانۂ عشق — ع
فریاد داغ — ۴؍
دیوان قاآنی — ۸؍
دیوان شہیدی — ۴؍

عجائب و غرائب

عجائب المخلوقات } تصویر رنگین — عہ
" با تصویر سادہ — للعہ
مجمع الفنون — ۸؍ے
طلسم فرنگ — ع
کارخانۂ عالم — عہ

رنالڈز کے ناولوں کے ترجمے

الہ دین دیلی — ۱۲؍عہ
فریب حسن — ع
سوزن عشق — ۸؍عہ
روزا لیمبرٹ — للعہ
نادان اسرار — ۸؍ع
شام جوانی — ۴؍ے
طلسمی فانوس — ۱۲؍عہ

نگار بک ایجنسی نظیر آباد لکھنؤ

ذیل کی کتابیں نگار بک ایجنسی سے طلب فرمائیے

اختر النساء ایک جاہل بد مزاج ساس کے مظالم ۴ر

نازنین مراکش ۸ر

عیار فقیر

عروس مصر تیمری صدی ہجری کے مصری اسلامی واقعات دلگداز مناظر

امیر المومنین عبد الرحمٰن ناصر اور ان کے بیٹوں کی معرکہ آرائیاں

ایمن بک خدیو مصر محمد علی پاشا

حجاج بن یوسف

حیرت انگیز شہر قیمت ۴ر

قاتل دیر ۴ر

خونی شہنی قیمت ۸ر

نیلی چھتری قیمت

بہرام کی رہائی قیمت

بہرام کی گرفتاری

بہرام کی واپسی قیمت ۴ر

مضمون نگار قیمت ۲ر

لغات المدارس قیمت ۱۲ر

انقلاب عثمانی جرجی زیدان کے مشہور تاریخی ناول کا ترجمہ

اسرار بالشویزم

خدا اور اس کی ہستی خدا کی ہستی کا ثبوت قیمت ۵ر

علم الاخلاق قیمت

خواتین انگورہ انگورہ کی مشہور اور بہادر خواتین

فلاح و کامیابی

سوراج قیمت ۸ر

نابینا علما ۴ر

حضرت عمر بن عبد العزیز

ازواج الانبیاء حضرات انبیاء کرام کی شریک حیات اور بیٹیوں کے حالات

محاصرہ کہیر ہفت سالہ جنگ

شوکت آرا بیگم قیمت

تہذیب نسواں

بیوی کی تربیت

مخدرات

حیات ابدی

معذرات تیموریہ

اقبال دلہن

رفیع الخیال قیمت ۱۲ر

نظام حیات انسانی انسانی زندگی کا دستور العمل قیمت ۸ر

مختارات صوفیہ قیمت

بیگمات بنگال بنگال کی بیگمات کا مستند تذکرہ قیمت ۲ر

منیجر رسالہ ”نگار“ نیا گاؤں لکھنؤ

مطبوعہ مختار پرنٹنگ پریس نیا گاؤں لکھنؤ باہتمام سید توسل حسین